بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش گفتار

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے سال ہو رہا ہے۔وقت کس قدر تیزی سے گذر رہا ہے اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ڈاکٹر صاحب کے اس قدر اچانک رخصت ہو جانے سے نہ جانے کتنے منصوبے ادھورے رہ گئے۔ان سے وابستہ اور ان کی صلاحیتوں کا کسی درجے میں علم رکھنے والا ہر شخص ان سے مزید استفادے اور ان کے تجربے،مشاہدے،علم اور بصیرت کو محفوظ کرنے کا کوئی نہ کوئی خاکہ ذہن میں بنائے ہوئے تھا،خود ڈاکٹر صاحب بھی کئی موضوعات پر کام کر رہے تھے یا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے،جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً اپنے ملنے والوں سے فرماتے رہتے تھے۔مگر اب یہ سب خواب ہوا۔

یہ سطور تحریر کرتے ہوئے یہ بات اس لئے نوک قلم آ گئی کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ خطبہ بھی جو قارئین کے سامنے ان صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے،تین سال سے زائد عرصے سے اس انتظار میں رکھا ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اسے ایک نظر ملاحظہ فرمالیں ،پھر اسے شائع کیا جائے۔افسوس ایسا نہ ہو سکا۔اب یہ ڈاکٹر صاحب کی نظر ثانی کے بغیر پیش خدمت ہے،کہ اس کے بغیر بھی نہایت مفید اور عوام وخواص سب ہی کے لئے تحفہ علم وبصیرت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگست ۲۰۰۷ء میں جب دار العلم والتحقیق کا قیام عمل میں آیا تھا تو سب سے پہلے مولانا سید زوار حسین شاہ رحمۃ اللہ یادگاری خطبے کی طرح ڈالی گئی تھی۔اس سلسلے کی پہلی تقریب ادارے کی بھی افتتاحی تقریب تھی،جو ۷ اگست ۲۰۰۷ء کو منعقد ہوئی اور جس سے ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ نے پہلے مولانا سید زوار حسین شاہ رحمہ اللہ یادگاری خطبے کے طور پر خطاب فرمایا۔ یہ خطبہ'' اسلام اور مغرب،موجودہ صورت حال ،امکانات،تجاویز'' کے زیر عنوان

تھا۔اسے بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا،اور پھر راقم کی ترتیب دی ہوئی کتاب ''اسلام اور مغرب تعلقات'' کا بھی وہ حصہ بنا۔

۲۰۰۸ء میں دوسرے خطبے کا مرحلہ آیا تو بھی ڈاکٹر صاحب ہی کو زحمت دی گئی اور انہوں نے ازراہ عنایت وشفقت ۲۱ اور ۲۲ جولائی ۲۰۰۸ء کو یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔یہ خطبہ ''سلامی شریعت،مقاصد وحکمت'' کے عنوان سے تھا۔یہ موضوع چوں کہ نہایت وسیع تھا،اس لئے اس پر گفت گو دو روز میں مکمل ہوئی،جس کی ریکارڈنگ کا دورانیہ چار گھنٹے پندرہ منٹ بنتا ہے۔یہ خطبہ نہایت اہمیت کا حامل ہے،جس کا اندازہ اس کے مطالعے سے ہی ہوسکتا ہے۔ان صفحات میں یہ خطبہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

الحمد للہ اس سلسلے کو مسلسل چار سال ڈاکٹر صاحب کی سرپرستی حاصل رہی،اور تیسرا،چوتھا یادگاری خطبہ بھی ڈاکٹر صاحب نے ہی ارشاد فرمایا،یہ خطبات بھی علیحدہ سے شائع کئے جارہے ہیں۔

چوں کہ یہ خطبات زبانی دیئے گئے تھے،اور ڈاکٹر صاحب ان پر نظر ثانی بھی نہیں فرما سکے،اس لئے اگر ان میں اغلاط رہ گئی ہیں تو ان کی ذمے داری راقم مرتب پر ہے،اور اس سلسلے میں رہ نمائی ہماری تقویت کا باعث ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے اور ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ،اس ادارے اور پوری امت مسلمہ کے لئے اسے مفید،بابرکت اور ذخیرہ آخرت بنائے،آمین۔

ملتمس دعا

سید عزیز الرحمٰن

۱۲ شوال المکرّم ۱۴۳۲ھ

۱۱ ستمبر ۲۰۱۱ء

دوسرا مولانا سید زوار حسین یادگاری خطبہ

اسلامی شریعت ۔ مقاصد و حکمت

ڈاکٹر محمود احمد غازی

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

قابل احترام جناب سید فضل الرحمٰن شاہ صاحب

محترم جناب ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

برادران گرامی!

میں سب سے پہلے آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی اور ایسے اہم موضوعات پر میری گزارشات سننے کے لئے تشریف لائے جو ہم سب کے لئے نہ صرف دینی اہمیت کا مسئلہ ہے، بل کہ ملک وملت کے مستقبل کا دار و مدار اس مسئلے کی صحیح فہم پر ہے۔ آج دنیائے اسلام کی بقا، اسلامی تہذیب کا تسلسل اور اسلامی ثقافت کا تحفظ جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ اسلامی شریعت کی حکمت اور مقاصد کی صحیح فہم، ان مقاصد اور حکمتوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں یا پیدا کی جارہی ہیں یا مختلف اسباب سے مسلمانوں کے ذہنوں میں جنم لے رہی ہیں، اُن کی تردید اور وضاحت ہے۔ آج مستقبل کے بارے میں ایک ایسے نقشے کی تیاری نہایت ضروری ہے، جس کی روشنی میں مسلمان اسلامی شریعت کے مطابق، اسلام کے معیار اور تقاضوں کی روشنی میں اپنی زندگی کی تشکیل کرسکیں، انفرادی زندگی، اجتماعی زندگی اور بین الاقوامی تعلقات کو اسلامی شریعت کے احکام کی روشنی میں منظم اور منضبط کرسکیں۔
اسلامی شریعت ایک ایسا مضمون ہے جس کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں خود

مسلمانوں میں اور مسلمانوں سے باہر دنیائے مشرق اور دنیائے مغرب میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔

مسلمانوں میں سے بہت سے حضرات کے ذہن میں شریعت چند محدود مذہبی عقائد اور اعمال کے مجموعے کا نام ہے، جس کو مذہبی مسلمان اپنی ذاتی زندگی میں انجام دیتے ہیں، اس کا اجتماعیات سے، سیاسیات اور معاشیات سے اور خاص طور پر بین الاقوامی تعلقات اور قانون ودستور سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہونا چاہئے۔ یہ تصور بہت سے مسلمانوں کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ مغرب میں ایک بہت بڑے طبقے نے کسی غلط فہمی کی وجہ سے، کسی بدنیتی کی وجہ سے یا اپنی کم علمی کی وجہ سے یہ تاثر پیدا کر دیا ہے کہ شریعت ایک ایسا نظام ہے جو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے، جس کی بنیاد بعض قدیم اور آرکائیک تصورات پر ہے، جس کا تعلق قدیم زمانے کے قبائلی معاشرے کے رواجات اور تصورات سے ہے، جو دورِ جدید کی تہذیب وثقافت تمدن اور حکمت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لئے جو لوگ شریعت کی بنیاد پر نظام بنانے یا چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ دراصل تہذیب وتمدن کے دشمن اور مخالفین ہیں۔ یہ بات دنیائے مغرب میں بڑے سے بڑے حضرات سے لے کر عام سطح کے اخبار نویسوں اور پالیسی سازوں میں سے بہت سے لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گئی ہے۔ مغربی دنیا کے بعض بڑے بڑے بااثر لوگ یہ اعلانات کرنے سے نہیں چوکتے کہ ہم مسلمانوں کو شریعت کی بنیاد پر نظام قائم کرنے کی اجازت نہیں دیں گے، اس عزم کا اظہار، مغربی دنیا کے بعض بڑے ذمے دار لوگوں نے کیا ہے۔ کن معلومات کی بنیاد پر کیا ہے؟ شریعت کے بارے میں ان کی معلومات، کتنی ہیں؟ اور کیا ہیں؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ ان عزائم اور اعلانات پر عمل درآمد کے بارے میں ان کی صلاحیت کیا ہے یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ شریعت کے بارے میں ان کا علم صفر سے آگے نہیں۔

مزید برآں! خود مسلمانوں میں سے بہت سے حضرات ایسے ہیں جن کو شریعت کے واجب التعمیل ہونے پر پورا ایمان وایقان حاصل ہے، جو شریعت کو ایک جامع نظامِ ہدایت سمجھتے ہیں، جو شریعت کو کامل اور متکامل تہذیبی رویے کو منضبط کرنے والا نظام قرار دیتے ہیں، لیکن خود شریعت کی اساس کن قواعد وضوابط پر ہے؟ کن اصولوں پر ہے؟ اس کے پیشِ نظر کیا حکمتیں ہیں؟ اس کا انہیں علم تفصیل سے نہیں ہوتا، اور تفصیل سے علم نہ ہو تو اطمینان قلبی کی وہ

کیفیت پیدا نہیں ہوتی، جس کا مطالبہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا۔ ایمان ان کا بھی تھا لیکن انہوں نے کہا تھا:

رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ (۱)

اے میرے رب مجھے بھی تو دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اللہ نے فرمایا کیا تجھے یقین نہیں آتا۔ حضرت ابراہیم نے کہا کیوں نہیں۔ لیکن میں اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔

حضرت ابراہیم کا یہ مطالبہ اپنے مزید اطمینان کے لئے تھا۔ اس بنا پر اطمینان قلبی کے حصول کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ شریعت کے مقاصد اور حکمتوں کا مطالعہ جاری رکھا جائے۔

یہ بات قرآنِ مجید میں بار بار بیان ہوئی ہے کہ اسلامی شریعت کچھ متعین مقاصد اور حکمتوں کو پورا کرنے کے لئے بھیجی گئی ہے۔ احادیث میں بار بار اس کا تذکرہ آیا ہے اور فقہائے اسلام نے اول سے لے کر آج تک، چودھویں صدی تک ہر دور میں اس پر اظہارِ خیال کیا ہے، اور اُن حکمتوں اور مقاصد کی مختلف پَرتیں ایک ایک کر کے کھولی ہیں، مزید ابھی کتنی کھلنی باقی ہیں، ہم نہیں جانتے۔ چوں کہ شریعت ہر دور کے لئے ہے، ہر علاقے اور ہر زمانے کے لئے ہے، اس لئے ہر علاقے اور ہر زمانے میں ہر دور میں اس کے حکمتوں کے نئے نئے پردے اٹھتے رہیں گے، اور حکمتوں کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے آتے رہیں گے۔ قرآن پاک سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے:

سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ (۲)

بہت جلد ہم آفاق میں بھی ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن برحق ہے۔

۱۔ البقرۃ:۲۶۰

۲۔ حم السجدہ:۵۳

اسلام نے شریعت کی اصطلاح جو استعمال کی ہے یہ بڑی معنیٰ خیز ہے۔ قرآن مجید جس زمانے میں نازل ہوا اس زمانے میں بہت سی اصطلاحات، بہت سے الفاظ عربی زبان میں مروج تھے۔ لیکن قرآن مجید نے ان میں سے کسی مروج اصطلاح کو استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید جو نئے تصورات دینا چاہتا تھا، قرآن مجید جو نئے ادارے قائم کرنا چاہتا تھا، جو نئے قواعد وضوابط دینا چاہتا تھا، ان قواعد وضوابط کے لئے ضروری تھا کہ وہ الفاظ و اصطلاحات استعمال کی جائیں جو پیچھے سے کوئی پس منظر نہ رکھتی ہوں اور ان کا کوئی ماضی نہ ہو۔ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے، اس مزاج کا پَرتو ان اصطلاحات میں پایا جاتا ہے۔ وہ اصطلاح جس زمانے میں جس ماحول میں پیدا ہوتی ہے، اس زمانے اور ماحول کے جراثیم اس اصطلاح میں پائے جاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ کچھ زبانیں، کنواری زبانیں ہوتی ہیں۔ اور کچھ زبانیں وہ ہوتی ہیں، جو بارہا تجربات سے گزر چکی ہوتی ہیں۔ جو زبانیں مختلف مذاہب اور تصورات اور تہذیبوں اور فلسفوں کے تجربوں سے گزرتی ہیں، ان سب تجربات کے جراثیم و وائرس اس اصطلاح میں، اس زبان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اس زبان کو اس وائرس اور جراثیم سے پاک نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی شاید ہم سب جانتے ہیں، انگریزی کی کوئی اصطلاح آپ لے لیں۔ اس اصطلاح کا اک پس منظر ہوگا۔ Law کا پس منظر ہے۔ جب آپ Law کا لفظ بولیں گے تو رومن Law آپ کے ذہن میں آئے گا۔ یونانیوں نے Law کے بارے میں جو لکھا ہے وہ آپ کے ذہن میں آئے گا۔ انگریزی قوانین میں لاء پر جو لکھا گیا ہے وہ آپ کے ذہن میں آئے گا۔ انیگلوسیکسن لاء کے سارے تصورات آپ کے ذہن میں آجائیں گے۔ Law کے لفظ کو ان جراثیم و وائرس سے پاک نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حال بقیہ زبانوں کا تھا جب قرآن نازل ہوا۔ عربی زبان وہ واحد زبان تھی جو کنواری زبان تھی، اس اعتبار سے کہ اس میں کوئی ایسی تہذیب پہلے سے موجود نہیں تھی، جس کے جراثیم و وائرس عربی زبان میں داخل ہو جائیں۔ اس لئے ایک تو خود عربی کا انتخاب آخری شریعت کے نزول کے لئے اس بنیادی حکمت کی وجہ سے ہے۔ پھر خود عربی زبان میں بھی ایسے الفاظ جو کسی وجہ سے پہلے مروج ہو گئے وہ قرآن پاک نے نہیں اپنائے، بل کہ نئے الفاظ قرآن پاک نے اپنائے۔ جن کا کوئی پس منظر نہیں تھا، سوائے اُس کے جو قرآن

پاک اس کو دینا چاہے۔ انہیں اصطلاحات میں سے ایک شریعت کی اصطلاح ہے۔

شریعت کے لغوی معنیٰ تو ہیں وہ کشادہ واضح راستہ جو آپ کو پانی کے ذخیرے تک لے جائے۔ عربی زبان میں اسلوب استعمال ہوتا ہے۔ شرع وارد پانی پینے والا دریا کے کنارے پہنچا، اور جا کر پانی پیا۔ آپ کسی چشمے پر، کسی دریا کے کنارے پر کسی کنویں پر پہنچے اور جا کر ڈول سے، ہاتھ سے یا کسی پیالے سے پانی لے لیں، اس عمل کو کہا جاتا ہے ''شرع'' اور یہ عمل عربی میں ''شرعاً'' کہلاتا ہے۔ پرانے زمانے میں گھروں میں نل نہیں ہوتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں یا گاؤں ہوتے تھے۔ خاص طور پر عرب میں جہاں پانی بہت کم تھا۔ ہر جگہ پانی نہیں ہوتا تھا۔ پانی کی اہمیت کا اس سے اندازہ کریں کہ پانی کے نام پر عربوں کے مقامات کے نام ہیں۔ جس قبیلے کی ملکیت میں وہ کنواں یا پانی ہوتا تھا اس قبیلے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی، یہ جملہ حدیث کی کتابوں میں آپ کو عام بہت ملے گا:

وكان لقبيلةفلان مآء

فلاں قبیلے کا پانی تھا۔

حتى وصلوا الى ماء لقبيلة فلان

صحابہ فلاں قبیلے کے پانی میں پہنچے۔

گویا پانی کی جو اہمیت تھی اس سے عربی زبان وادب کا ہر طالب علم واقف ہے، اس لئے کہ پانی ہر جگہ نہیں ہوتا تھا۔ شہر سے باہر، بستی سے باہر ہوتا تھا۔ وہیں سے لوگ پانی اپنی ضرورت کے لئے لینے جایا کرتے تھے۔ لوگ بستی میں پانی لینے جائیں گے تو کوئی لمبا چکر لگا کر پانی لینے نہیں جائے گا، بل کہ سیدھے راستے سے جائیں گے جو راستہ قریب ترین ہوگا، سیدھا ہوگا، اس پر بار بار چلنے سے ہم وار ہو جائے گا، اس راستے میں جو پتھر ہوں گے وہ ہٹ جائیں گے، جب چوپائے بھی چلیں گے، اونٹ بھی چلے گا، گائے بھی چلے گی، بیل بھی چلے گا، گھوڑا بھی چلے گا انسان بھی چلیں گے وہ تو راستہ ہم وار ہو جائے گا، کشادہ ہو جائے گا، یہ تین خصوصیات اس راستے میں ہوں گی کہ وہ سیدھا ہوگا، کشادہ ہوگا اور آسان ہوگا۔ عربی میں اس راستے کو جو پانی تک لے جائے اور ان تین خصوصیات کا حامل ہو شریعہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے، جو فعیلہ کے وزن پر ہے۔ فعیل کے وزن میں جو اوزان ہیں اس میں دوام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس

لئے شریعت کے مفہوم میں بھی دوام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ وہ راستہ دائمی راستہ ہوگا، یہ نہیں ہوگا کہ آج ہے، کل نہیں ہوگا، کل ہے پرسوں نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں دوام کی صورت بھی پائی جائے گی۔قرآن پاک میں کہا گیا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ط (۳)

ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔

گویا وہ راستہ جو زندگی کے مصدر و ماخذ تک لے جائے اور ان چار خصوصیات کا حامل ہو وہ ''شریعۃ'' کہلائے گا۔ یہ اصطلاح قرآن پاک میں اس نظام کے لئے اپنائی جو قرآن پاک لے کر آیا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ قرآنِ پاک جس پیغام کو لے کر آیا ہے اس کا مقصد حقیقی اور آخرت کی زندگی میں کامیابی ہے۔ آخرت کی زندگی ہی درحقیقت اصلی زندگی ہے:

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَo(۴)

بے شک آخرت کا گھر ہی زندگی ہے، کاش وہ جانتے۔

یہاں ''ل'' بھی ہے اور ''ھی'' بھی، یہ تاکید کا صیغہ ہے۔ میں اس کا انگریزی ترجمہ اس طرح کرتا ہوں۔

Where live the life in the here, after is the real life par excellence.

Par Excellence. انگریزی اور فرانسیسی کی اصطلاح ہے۔ جس میں کسی فردِ کامل پر جب اصطلاح کا اطلاق ہو تو اس کو کہا جاتا ہے. Par Excellence۔ فلاں فرد اپنی صنف یا نوع میں کامل ہے۔ اس کے لئے انگریزی کی یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ تو اپنے مکمل مفہوم میں، دارآخرت کی زندگی حقیقی زندگی ہے، جو راستہ اس تک لے کر جائے وہ سیدھا بھی ہونا چاہئے، کشادہ بھی ہونا چاہئے، آسان بھی ہونا چاہئے اور دائمی بھی ہونا چاہئے۔ یہ چاروں خصوصیات اس میں بھی ہونی چاہئیں۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی کے خصائص جو مختلف احادیث میں بیان ہوئے ہیں

۳۔ الانبیاء:۳۰

۴۔ العنکبوت:۶۴

ان میں یہ چاروں خصائص بیان ہوئے ہیں۔ایک جگہ آیا ہے،مثلاً:

بعثت بالحنیفیة السمحة (۵)

اورفرمایا:

قد ترکتکم علی البیضاء لیلها کنهارها(۶)

یعنی وہ شریعت اس قدر روشن ہے اور سیدھی، آسان اور منور ہے رات کو بھی دن کا سماں رہتا ہے۔اس میں کبھی تاریکی نہیں ہوتی۔

اس میں بھی دوام کا مفہوم سامنے آتا ہے۔دن اور رات جس پر طاری ہوں اس میں دوام نہیں ہوتا، جو دن اور رات سے ماورا ہو، ہمیشہ روشن ہو، اس میں زوال نہیں آتا۔ زوال اس کو آتا ہے جس پر دن رات طاری ہوتے ہوں۔اور جو دن رات سے ماورا ہو وہ زوال سے بھی ماورا ہے۔یہ وہ اصطلاح ہے جو قرآن پاک نے استعمال کی ہے۔اس اصطلاح میں بنیادی تصور چلنے اور سفر کرنے کا ہے۔آپ ایک سفر میں مصروف ہیں،جس کا مقصد حقیقی اور آخری کامیابی تک پہنچنا ہے۔جب آپ اس راستے پر چلیں گے تو انفرادی طور پر بھی چلیں گے اور دوسروں کے ساتھ مل کر بھی چلیں گے،آپ کے گھر والے بھی چلیں گے، بیوی بھی چلے گی، بچے بھی چلیں گے، ماں باپ بھی چلیں گے، چلتے ہوئے آپ کو کھانے پینے کی بھی ضرورت پڑے گی۔راستے میں خرید وفروخت بھی کرنا پڑے گی، لین دین بھی کرنا پڑے گا،قافلے سفر کی صورت میں ہوگا۔اس لئے اس کا ایک امیر قافلہ بھی ہوگا۔تو زندگی کے جتنے بھی پہلو ہوں، چاہے وہ سیاسی ہوں،اقتصادی ہوں، بین الاقوامی ہوں، خاندانی ہوں،معاشرتی ہوں،سب کے سب اس راستے میں سامنے آئیں گے۔اس لئے اگر شریعت کا مفہوم راستے کا مفہوم ہے اور زندگی سفر سے عبارت ہے تو اس راستے میں ان سب چیزوں کا بندوبست ہونا چاہئے۔

اگر آپ سے کہا جائے یہ راستہ آپ کو کلکتے تک لے جاتا ہے۔آپ اس پر سفر کریں کلکتے پہنچ جائیں گے۔راستے میں نہ پانی ہو نہ سفر کا انتظام ہو، نہ رات گزارنے کا

۵۔ ہیثمی۔مجمع الزوائد: ج۴،ص۳۹۷،رقم ۶۱۳۷

☆ احمد۔المسند: ج۷،ص۴۲۹،رقم ۲۶۴۷۶

۶۔ حاکم۔المستدرک: ج۱،ص۱۷۵،رقم ۳۳۱

بندوبست ہو۔ ڈاکو بھی ہوں، بھیڑیے بھی ہوں اور زہریلے جانور بھی ہوں تو، یہ راستہ سفر کے لئے مناسب نہیں ہے۔ سفر کا مناسب راستہ وہ ہے جس میں سفر کا سارا بندوبست موجود ہو، اس لئے سفر کا بندوبست اس بات کا متقاضی ہے کہ شریعت میں زندگی کی ساری پہلوؤں کی رہنمائی موجود ہو، ورنہ وہ شریعت نہیں ہے۔ اس کو شریعت نہیں کہا جاسکتا۔ قانون ممکن ہے کہا جاسکتا ہو، اس لئے کہ قانون انگریزی زبان میں، جس کو کہتے ہیں وہ محدود چیز ہے۔ قانون کی تعبیر انگریزی مصنفین نے کی ہے Command of The Sovereign کسی بالا دست حاکم کا حکم، بالا دست حاکم حکم دے کہ رات کے دس بجے ٹریفک بند کردو تو آپ کو بند کرنا پڑے گا۔ بالا دست حاکم حکم دے کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک بجلی بند کردو تو آپ کو بند کرنا پڑے گی۔ لیکن اس کا کوئی تعلق آپ کی خاندانی زندگی سے، تجارت سے، لین دین سے، مذہب سے کسی بھی چیز سے نہ ہوگا۔ اس خاص پہلو میں وہ قانون واجب التعمیل ہوگا، اس سے پہلے بھی نہیں ہوگا، اس کے بعد بھی نہیں ہوگا۔ اس لئے شریعت نے ایسا کوئی محدود معانی والا لفظ استعمال نہیں کیا، قرآن پاک نے کوئی ایسی اصطلاح بیان نہیں کی جو کسی محدود مفہوم پر دلالت کرتی ہو یا اس کو محدود سمجھا جاسکتا ہو یا اسے محدود کیا جاسکتا ہو۔

بعض حضرات دور جدید میں جب شریعت کو بیان کرتے ہیں تو اکثر قانونِ شریعت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، افہام وتفہیم کی غرض سے قانونِ شریعت کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن بعض اوقات اس کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب قانون کی اصطلاح سے شریعت کو جوڑ دیا جاتا ہے تو دوسروں کے ذہن میں جو قانون کی جو تحدیدات ہیں یا قانون کا جو محدود مفہوم ہے وہ شریعت پر منطبق ہونے لگتا ہے۔ جو شریعت کو نہیں جانتے لیکن قانون کو جانتے ہیں، وہ ذہنی طور پر یا فکری طور پر اس تصور کو اس محدود چوکھٹے کو لاکر شریعت میں منتقل کرتے ہیں۔ شریعت کو اس کے اندر محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کچھ حضرات نے شریعت کے لئے کچھ اور اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اس کے خیال میں شریعت محض چند مذہبی اصول کا مجموعہ ہے۔ یقیناً شریعت میں مذہبی احکام بھی ہیں۔ شریعت میں خالص عبادات سے متعلق احکامات ہیں جو شریعت کے اہم ترین احکام ہیں۔ شریعت کے احکام میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، لیکن لین دین کے احکام کو کوئی نسبت ان مذہبی

طور طریقوں سے یا اُن مذہبی تصورات یا اصولوں سے نہیں ہے جو دنیا کے اور مذاہب میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوؤں میں بعض مذہبی تصورات ہیں، سکھوں میں ہیں، بدھسٹوں میں ہیں، عیسائیوں میں ہیں، یہودیوں میں ہیں۔ اگر اُن تصورات کا فقہ اسلامی کے ان احکام سے تقابلی مطالعہ کیا جائے، جو شریعت میں بیان ہوئے ہیں، مثلاً نماز سے متعلق یا مثلاً روزے سے متعلق تو ان میں بنیادی فرق محسوس ہوتا ہے۔ وہ بنیادی فرق یہ ہے کہ شریعت میں جو احکام مثلاً نماز کے بارے میں ہے وہ شریعت کے عمومی نظام کا ایک حصہ ہیں۔ ایک Integral Part (اٹوٹ انگ) ہیں۔ ان دونوں کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ جو مذہبی تصورات یا احکام ہندوؤں میں پائے جاتے ہیں، اُن کا ہندوؤں کی بقیہ اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو بہت متعصب ہندو تھے۔ ہندوؤں کے مفاد کی خاطر مسلمانوں کو بہت سا نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن ان کی سیاسی زندگی کا کوئی تعلق ان کے مذہبی معاملات سے نہیں تھا۔ ان کے مذہبی تصورات اور عقائد ان کی ذات تک محدود تھے۔ اس لئے کہ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

اُن تصورات کو پھیلانے میں کچھ علمائے کرام کا بھی حصہ ہے۔ جب میں بچپن میں یہاں جیکب لائن میں ایک مسجد میں، قرآن پاک پڑھا کرتا تھا تو ایک اصطلاح میں سنتا تھا، شرعی پاجامہ، شرعی ٹوپی اور شرعی رومال۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ شرعی پاجامہ وہ ہوتا ہے جو شلوار کی شکل کا ہو، ذرا اونچا ہو، ٹخنوں سے اونچا ہو اور اس کی ایک خاص شکل ہو۔ فی نفسہ کسی اصطلاح میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لا مشاحۃ فی الاصطلاح لیکن چوں کہ شریعت سے عمومی واقفیت نہیں تھی اور شرعی پاجامہ کی اصطلاح مروج ہوگئی تو یہ تصور پیدا ہوگیا کہ ایک خاص حلیہ شریعت کا تقاضا ہے اور اس حلیے کے حامل کو حامل شریعت کہتے ہیں۔ جس نے بالآخر شریعت کے بارے میں بہت محدود اور منفی تاثر قائم کیا۔

شریعت کو انگریزی میں اگر بیان کیا جائے تو کیسے بیان کریں؟ یہ بڑا دشوار ہے اور یہ چیلنج ہمیشہ میرے سامنے رہا ہے، اوروں کے سامنے بھی رہا ہوگا۔ بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید شریعت کوئی سسٹم ہے، ایک ایسا سسٹم جو پوری زندگی کو محیط ہے۔ سسٹم کے لفظ سے اس کو بیان کیا جائے، لیکن جب سسٹم کے انگریزی تضمنات کو دیکھتے ہیں تو سسٹم کا لفظ

ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ سسٹم کا لفظ بھی انگریزی ماحول کی پیداوار ہے تو جو سسٹم کے تضمنات ہیں وہ شریعت میں منطبق ہونے لگتے ہیں۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ شاید شریعت ایک پیراڈائم ہے۔ پیراڈائم پچھلے تیس چالیس سال سے ایک اصطلاح نکلی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ پیراڈائم سے مراد ایک ایسا نظام ہے جو کوئی نیا اسلوب دے، اور اس اسلوب کے نتیجے میں زندگی کی ہر چیز بدل جائے اور ایک نئے انداز سے سامنے آئے۔ اس لئے سمجھنے کی خاطر محض عارضی طور پر سمجھانے کے لئے شریعت کو ایک پیراڈائم قرار دیا جاسکتا ہے کہ شریعت ایک ایسا پیراڈائم ہے جس کی بنیاد روحانی تصورات اخلاقی اقدار، اور قرآن مجید کے احکام اور سنت نبوی کی ہدایات پر ہیں۔ جو زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک مثبت تبدیلی چاہتی ہے۔ ایسی مثبت تبدیلی جس میں اخلاق کی اسپرٹ موجود ہو۔ جس میں روحانیت کا جذبہ کارفرما ہو۔ اور جس کی آخری منزل اور آخری ہدف ومقصود اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ اس پیراڈائم کے تحت جو بھی انسانی زندگی کے نظامات ہیں، قوانین ہیں، اخلاق اور ہدایات ہیں ان سب میں کلی یا جزوی تبدیلی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ لہٰذا یہ کہنا حق بہ جانب ہوگا کہ شریعت ایک کلی تبدیلی کا نظام ہے، مکمل تبدیلی کا ایک نظام ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتا ہے۔

بعض حضرات نے بیسویں صدی میں جب یہ دیکھا کہ شریعت مکمل تبدیلی کا ایک نظام ہے اور مکمل تبدیلی کو مغربی اصطلاح میں انقلاب کہتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اسلام ایک انقلابی تحریک ہے۔ یہ بھی سمجھانے کی خاطر ایک اصطلاح تھی، جس سے وہ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ شریعت اُس طرح کی ایک تبدیلی چاہتی ہے جس طرح کی تبدیلی بہت سے انقلابات چاہتے ہیں۔ لیکن چوں کہ انقلاب یا ریوولوشن یا ثورۃ ایک خالص مغربی اصطلاح ہے، مغربی دنیا فرانسیسی انقلاب سے واقف تھی، جس کا انداز یہ تھا کہ ہر چیز کو توڑ پھوڑ دو، ہر چیز درہم برہم کردو۔ دنیا کمیونسٹ انقلاب سے واقف تھی جس کی بنیاد اسی بات پر تھی کہ ہر چیز کو تباہ برباد کردو۔ اس بنا پر انقلاب کے لفظ سے بہت سے لوگوں کے ذہن میں آیا کہ شاید شریعت بھی یہی چاہتی ہے۔ حال آں کہ شریعت اس مفہوم میں انقلاب نہیں ہے، تبدیلی ضرور ہے، ہر پہلو میں تبدیلی ہے، لیکن ایک تبدیلی جو تباہی کے نتیجے میں آئے وہ تبدیلی اور ہوتی ہے اور جو تبدیلی کسی تعمیر کے نتیجے میں آئے وہ تبدیلی اور ہوتی ہے۔ تخریبی تبدیلی اور ہے، تعمیری تبدیلی اور

ہے۔خنجر ڈاکو کے پاس بھی ہوتا ہے اور ڈاکٹر کے پاس بھی ہوتا ہے۔ڈاکٹر اس سے نشتر کا کام لیتا ہے، ڈاکو اس سے کوئی اور کام لیتا ہے۔اس لئے بعض اوقات ظاہری مشابہتیں یا جزوی مناسبتیں کسی عارضی مثال یا کسی بات کی وضاحت کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، لیکن آگے چل کر وہ کسی غلط فہمی کا سبب بن جاتی ہیں۔

شریعت جس طرح کی تبدیلی چاہتی ہے اس تبدیلی کے بارے میں شریعت کا رویہ اور نقطہ نظر یک ساں نہیں ہے، بعض معاملات میں شریعت مکمل تبدیلی چاہتی ہے، بعض معاملات میں بڑی تبدیلی چاہتی ہے، بعض معاملات میں جزوی تبدیلی پر اکتفا کرتی ہے، اس تبدیلی کے اعتبار سے، ہر اعتبار سے، علمائے اسلام نے شریعت کے مستند اور محترم اور معتبر ماہرین نے شریعت کے احکام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق عقائد وعبادات سے ہے، اس میں شریعت مکمل تبدیلی کی علم بردار ہے، ماضی کی ہر چیز سے لاتعلقی کرو اور شریعت کے عقائد اور شریعت کی عبادات کو اختیار کرو۔ ماضی کی اگر کوئی چیز شریعت سے متصادم نہیں ہے، بل کہ اس کے مطابق ہے تو قابل قبول ہے، اور کے اگر وہ شریعت مطابق نہیں ہے تو وہ نا قابل قبول ہے۔کوئی ایسا عقیدہ جس کا شریعت میں بیان نہیں ہے وہ اسلامی عقیدہ نہیں۔کوئی ایسی عبادت جس کا شریعت میں تذکرہ نہیں ہے وہ اسلامی عبادت نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس میں شریعت بہت جزرسی اور اہتمام کے ساتھ مکمل تبدیلی اور مکمل انضباط کا تقاضا کرتی ہے۔

اس کے بعد دوسرا بڑا میدان ہے معاملات کا۔جس کو اصطلاح میں فقہائے اسلام نے معاملات کے نام سے یاد کیا ہے۔معاملات میں دو پہلو ہیں۔ایک پہلو معاملات کا وہ ہے جس کا بہ راہِ راست تعلق انسان کی زندگی پر پڑتا ہے۔ انسان کی عائلی زندگی ہے، خاندانی معاملات ہیں، ازدواجی تعلقات ہیں، ماں باپ اور اولاد کے درمیان تعلقات ہیں، رشتہ داروں کے درمیان تعلقات ہیں۔ان معاملات میں چوں کہ بہت سی ناانصافیاں ہوتی ہیں، بہت سی زیادتیاں ہوتی ہیں، اس لئے شریعت نے اس پہلو سے بہت مفصل ہدایات دی ہیں۔ آپ قرآنِ پاک کی آیات احکام کا جائزہ لیں، تو آیات احکام کا تقریباً ایک تہائی حصہ ہے جو اس پہلو سے متعلق ہے، نکاح وطلاق اور خاندانی معاملات سے متعلق ہے۔اس لئے کہ شریعت

اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ ان مضبوط بنیادوں پر زور دیا گیا ہے اور بقیہ معاملات میں آزادی ہے۔ ان بنیادوں کے اندر جو طرزِ عمل انسان اختیار کرنا چاہے وہ کرسکتا ہے۔ شریعت اس میں رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ یہ معاملات دیرپا ہوتے ہیں۔ آپ نے ایک خاتون سے معاملہ کیا، نکاح کرلیا، چالیس برس پچاس برس اس کے ساتھ گزارنے ہیں۔ اس کی اولاد آپ کی اولاد ہے، آپ کی اولاد اس کی اولاد ہے۔ اس کے ماں باپ آپ کے ماں باپ ہیں، آپ کے ماں باپ اس کے ماں باپ ہیں۔ آپ کے ماں باپ اس کے محرم ہیں، اس کے ماں باپ آپ کے محرم ہیں۔ اس لئے یہ ایک دائمی اور دیرپا تعلق ہے۔ اس لئے شریعت اس میں بہت اہتمام کا مظاہرہ کرتی ہے، اور اس کے قواعد وضوابط بہت تفصیل سے بیان کرتی ہے۔

معاملات کا دوسرا حصہ وہ ہے جو دیرپا نہیں ہوتا۔ میں آپ سے سڑک پر ملا، آپ نے کہا کہ میں یہ قلم بیچتا ہوں، دس روپے میں لے لو، میں نے دس روپے دیئے قلم لے لیا، دو منٹ میں معاملہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد شاید زندگی میں میری آپ کی ملاقات نہ ہو۔ اس طرح کے معاملات میں شریعت نے وہ رویہ نہیں رکھا جو پہلی قسم کے معاملات میں رکھا۔ یہاں شریعت نے اُن حدود کی نشان دہی کرنے پر اکتفا کیا، جن کی خلاف ورزی کرنے سے میرے حق کی یا آپ کے حق تلفی ہوسکتی ہے۔ شریعت اس امر کا اہتمام کرتی ہے کہ آپ کا حق بھی مجروح نہ ہو، میرا حق بھی مجروح نہ ہو۔ اس کے لئے راستے متعین کردیئے کہ اس راستے کے اندر رہو گے تو سب کا حق محفوظ رہے گا۔ عدل وانصاف سب کو ملے گا۔ یہاں شریعت نے دو پہلو پیش نظر رکھے ہیں۔ فقہ کے طلبہ جانتے ہیں، فقہ کی کتابوں میں اکثر ہوتا ہے:

فی مابینه وبین الله،فیما بینه وبین الناس

اعتبار قضائی اور اعتبار دیانتی۔ دیانتاً ایسے ہوتا ہے اور قضا ایسے ہوتا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ انسانی معاملات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ انسانی معاملات ایسے ہیں کہ جس میں آپ پورے تعین کے ساتھ، پورے سو فیصد اطمینان کے ساتھ ایک چیز کو تعین کرسکتے ہیں۔ کچھ معاملات ایسے ہیں کہ اس میں سو فیصد یقین کے ساتھ اس کا تعین نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور میں نے آپ سے یہ گلاس خریدا، آپ نے کہا کہ اس کی قیمت پچاس روپے ہے، میں نے خرید لیا اور کہا پچاس روپے آپ کو کل ادا کردوں گا۔ اب یہ پچاس روپے

ایک متعین رقم ہے، نہ انچاس روپے ۹۹ پیسے ہوسکتے ہیں نہ پچاس روپے ایک پیسہ ہوسکتا ہے۔ پچاس کا مطلب پچاس۔ بس یہاں شریعت قضاءً حکم دیتی ہے۔ یہاں قاضی کو مداخلت کا اختیار ہے، اس لئے کہ قاضی پچاس روپے کا تعین کرسکتا ہے۔ جو بھی قاضی ہوگا وہ اچھا قاضی ہو یا برا قاضی ہو، قاضی شریح ہو یا موجودہ دور کا کوئی قاضی ہو۔ وہ پچاس روپے کو پچاس ہی قرار دے گا۔ پچاس کو اکیاون یا انچاس نہیں کہے گا۔ اس لئے یہاں شریعت نے معاملات قضا کے سپرد کئے ہیں۔ کچھ معاملات وہ ہیں جس میں فرد کی رائے اثر انداز ہوتی ہے انگریزی میں کہہ سکتے ہیں کہ جو subjective ہوتے ہیں جس میں ہر انسان اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہے جو دوسرے کی رائے سے مختلف ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر شریعت کہتی ہے:

لایؤمن احد کم حتی یحب لاخیہ اولجارہ ما یحب لنفسہ(۷)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے (ایک روایت میں ہے اپنے پڑوسی کے لئے) وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

اب اس میں رائے کا اختلاف ہوسکتا ہے۔ ایک شخص کی رائے میں اس پر عمل درآمد کا طریقہ یہ ہے دوسرے کی رائے میں یہ ہے، تیسرے کی رائے میں یہ ہے۔ شریعت کہتی ہے:

من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر، فلیکرم ضیفہ (۸)

جو شخص اللہ پر روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا احترام کرے۔

اب یہاں مہمان کے احترام سے کیا مراد ہے؟ کیا مہمان کے احترام سے مراد یہ ہے کہ اسے لازمی طور پر کھانا بھی کھلایا جائے، چائے بھی پلائی جائے۔ یا محض سلام دعا کرنا کافی ہے۔ ظاہر ہے مہمان اور مہمان میں فرق ہوگا۔ وقت اور وقت میں فرق ہوگا۔ حالات اور حالات میں فرق ہوگا۔ اس میں اس طرح کا تعین ممکن نہیں ہے جتنا پچاس روپے کا تعین ممکن

۷۔ احمد۔المسند: ج۴،ص۲۵۳، رقم ۱۲۸۳۲

۸۔ احمد۔المسند: ج۳،ص۴۹۱۔عن ابی سعید الخدری

ہے۔ پچاس روپے ہر صورت میں پچاس روپے ہیں۔ مہمان کی تکریم حالات کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہے۔ فرد کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہے۔ یہاں شریعت نے عدالت اور قضا کی مداخلت کی اجازت نہیں دی۔ یہ معاملہ دیانتاً طے ہوتا ہے۔ فقہا لکھتے ہیں کہ بعض معاملات وہ ہیں جن کے بارے میں مبتلیٰ بہ خود طے کرے، جو شخص اس وقت صورت حال کا سامنا کر رہا ہے وہ خود طے کرے گا، وہ اپنی دانست میں انتہائی دیانت داری سے شریعت کے حکم کو کیسے سمجھتا ہے اور کیسے عمل کرتا ہے۔ جو وہ دیانت داری سے یہ سمجھے کہ شریعت یہ چاہتی ہے وہ یہ کرے۔ لیکن یہ بات یاد رکھئے گا، بعض ایسے متجہدین، جو لوگ حقیقت جانتے ہیں وہ سمجھ جائیں گے کہ متجہدین سے کیا مراد ہے؟ متجہدین سے مراد جعلی مجتہدین، بعض متجہدین شریعت کے احکام سے جزوی طور پر چیزیں نکال کر اس کو غلط جگہ تعبیر کرتے ہیں۔ ایک مشہور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> **استفت نفسک، البر ما اطمأن الیه القلب و اطمأنت الیه النفس والاثم ماحاک فی القلب وتردد فی الصدر وان افتاک الناس (۹)**
>
> اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے، جس پر دل مطمئن ہو، اور گناہ وہ ہے، جو دل میں محسوس ہو، اور سینے میں اس پر تردد ہو، اگرچہ لوگ اس کے درست ہونے کا فتویٰ ہی کیوں نہ دیں۔

اس کا تعلق دیانات سے ہے، جو انسان خود طے کرتا ہے جو subjectively طے کئے جاتے ہیں۔ ان کا قضائی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ سے میں پچاس روپے کا گلاس خریدوں اور دل سے پوچھوں، دل کہے دس روپے دے دو۔ اس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔ یہ دنیا کا کوئی قانون اجازت نہیں دے سکتا۔ شریعت کہتی ہے پانچ وقت کی نماز پڑھو، دل کہے چار وقت کی کافی ہے، یہاں استفتِ نفسک نہیں چلتا۔ استفتِ نفسک کا معاملہ وہاں ہے جہاں اعتبارِ دیانی ہو۔

گویا تین چیزیں ہمارے سامنے آئیں، جہاں شریعت تبدیلی کرتی ہے اور شریعت کی روشنی میں وہاں تبدیلی آنی چاہئے۔

۹۔ احمد: ج ٦، ص ۲۷۱، رقم ۱۸۱٦۴

ایک وہ پہلو ہے جہاں شریعت نے مکمل تبدیلی پیدا کی اور اس تبدیلی کے علاوہ کوئی اور تبدیلی قابل قبول نہیں ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک من احدث فی امرنا کا تعلق اسی سے ہے۔اس کا عادات سے تعلق نہیں ہے، جو لوگ عادات سے اس کا تعلق بیان کرتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں، وہ لوگ شریعت کو نہیں سمجھتے۔عقائد اور عبادات میں سو فیصد شریعت کی پابندی لازمی ہے۔اور جو آزادی ہے وہ اُن حدود کے اندر ہے جو شریعت نے بتائی ہیں۔

معاملات کے دوسرے حصے میں شریعت نے محرمات کے بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور بقیہ معاملات میں آزاد چھوڑ دیا۔ مضاربت کے جو طریقے آپ کرنا چاہیں، آج پاکستان جس طریقے سے مضاربت ہورہی ہے یہ اُس سے بہت حد تک مختلف ہے جو فقہ کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔اس طرح پہلے مضاربت نہیں ہوتی تھی۔آج مضاربت کی نئ شکلیں ہیں، جو اِس دور کے علمائے کرام نے مرتب کی ہیں۔ چناں چہ آج کے لحاظ سے مضاربت ومشارکہ کی شکلیں جو آج رائج ہورہی ہیں وہ سابقہ شکلوں سے مختلف ہیں، اجارہ اور لیزنگ کی جو شکلیں آج ہیں وہ سابقہ کتاب الاجارہ سے مختلف ہیں، آپ آج کل کی لیزنگ کا جو اسٹیٹ بینک کا معیار ہے، اس کے جو تقاضے ہیں انہیں اور کتاب الاجارہ کو ملا کر دیکھیں تو آپ کو زمین آسمان کا فرق لگے گا۔لیکن جس طرح وہ شریعت کے مطابق تھا یہ بھی شریعت کے مطابق ہے۔اس لئے کہ وہ بھی اُن محرمات سے پاک تھا، یہ بھی ان محرمات سے پاک ہے۔

اور اس کے بعد آخری ایریا عادات کا ہے۔جس کا تعلق لوگوں کے مقامی رواجات اور رسوم سے ہوتا ہے۔خود پاکستان میں، ہمارے صوبہ سرحد کے علاقے میں اور طرح رواجات ہیں۔کراچی میں اور طرح کے ہیں، سندھ کے دیہات میں اور طرح کے ہیں۔اور شریعت نے کبھی نہیں کہا کہ لوگ اپنے رواجات کو چھوڑ دیں۔سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب شام تشریف لے گئے اور وہاں ایک نیا رواج دیکھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توجہ دلانے پر آپ خاموش ہوگئے۔سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُس پر اعتراض نہیں کیا۔ یہ بات تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے، لیکن جب کوئی رواج مسلمانوں میں جنم لیتا ہے تو مسلمانوں کا ماضی میں یہ مزاج رہا ہے اور کم از کم، بڑی حد تک آج بھی ہے کہ مسلمان اُس رواج کا احکامِ شریعت

کی روشنی میں جائز لیتے ہیں، اور پھر وہ تدریج مسلمانوں کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔

یہ بات میں نے تمہید میں اس لئے عرض کی کہ یہ غلط فہمی بھی میں دور کرنا چاہتا ہوں بہت سے حضرات جب اس طرح کی بات سنتے ہیں کہ شریعت نے عادات کے معاملات میں سختی نہیں کی، اور رواج کوئی بھی اختیار کیا جا سکتا ہے تو اس کو کلمۃ حق ارید بہا الباطل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اصول تو یہ بیان کرتے ہیں کہ عادات میں شریعت نے سختی نہیں کی، اس اصول کے بعد تبدیلی کرنا چاہتے ہیں معاملات میں یا آگے بڑھ کر شریعت کے بقیہ احکام میں، جہاں شریعت نے اس تبدیلی کی اجازت نہیں دی۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی دوسری قوم کا رواج اختیار کرنے میں مسلمان ہمیشہ محتاط رہا ہے، مسلمان جہاں بھی رہے انہوں نے مقامی رواجات کو قبول کرنے میں تامل نہیں کیا، لیکن اُن رواجات کو اسلام کی شرائط پر قبول کیا۔ پہلے یہ دیکھا کہ کیا چیز شریعت کے مزاج اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اگر کوئی چیز شریعت کے مزاج اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہے تو مسلمانوں نے اس کو قبول کیا اور اگر ہم آہنگ نہیں تھی تو اس کو قبول نہیں کیا۔ آج دنیائے اسلام میں مغرب کے بہت سے رواجات ایک ایک کر کے جنم پا رہے ہیں۔ اُن میں بعض ایسے رواجات بھی ہیں جو شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لیکن یہ رویہ اور طرزِ عمل مسلمانوں میں کم زور ہو گیا ہے کہ وہ ہر آنے والی چیز کو شریعت کی میزان میں تولیں اور تولنے کے بعد فیصلہ کریں۔

یہ تین معاملات ہیں جن میں شریعت تبدیلی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں انسان کی ایک نئی شخصیت پیدا ہوگی۔ جب اس کے حقائق دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ اس کی شخصیت مختلف ہوگی۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں ایک نیا نظام اخلاق پیدا ہوگا، ایک نیا معاشرہ جنم لے گا، خاندان کے ادارے کی ایک نئی جہت پیدا ہوگی، معاشرے کا چلن نئے انداز کا بنے گا، جو قوانین بنیں گے وہ نئے انداز کے بنیں گے، جو تہذیب قائم ہوگی وہ نئے انداز کی قائم ہوگی۔ جس تہذیب کی اساس اخلاق اور تعلق مع اللہ پر ہو، جس تہذیب کا آخری مقصد اور ہدف رضائے الٰہی ہو، اُس کی ہر چیز میں وہ جھلک نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ طرزِ تعمیر میں بھی اس کی جھلک نظر آئے گی، حتیٰ کہ ٹاؤن پلاننگ میں نظر آئے گی۔ یہ کہنا تو آسان ہے کہ شریعت نے کسی ٹاؤن پلاننگ کا حکم نہیں دیا، یقیناً شریعت نے کہیں نہیں کہا کہ اے مسلمانو! ٹاؤن پلاننگ

اس طرح کرو۔ لیکن جب مسلمان ایک دینی رویے سے ٹاؤن پلاننگ کرتا ہے تو اس کی ٹاؤن پلاننگ اور طرح کی ہوتی ہے۔ ایک غیر مسلم جو آخرت کی جواب دہی پر ایمان نہ رکھتا ہو، جس کی نظر میں ایمانیات اور عبادات کی بنیادی حیثیت نہ ہو، وہ ٹاؤن پلاننگ اور طرح کرے گا۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب کوفہ و بصرہ آباد کئے گئے تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سلسلے میں مفصل ہدایات دیں۔ پہلے دو صحابہ کو بھیجا کہ جا کر اُس زمین کا سروے کر کے آئیں۔ انہوں نے زمین کا سروے کیا، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو رپورٹ دی، پھر انہوں نے بغیر کسی نقشے کی مدد سے محض اُن کی رپورٹ کی بنیاد پر جگہ کا تعین کیا کہ فلاں جگہ کوفہ اور بصرہ بسائے جائیں۔ اور ایک چھڑی سے ریت پر نقشہ بنا کر بتایا کہ اس طرح بسایا جائے۔ میں نے یہ بات بہت سے ٹاؤن پلاننگ کے ماہرین کو بتائی، اُن میں سے سب نے، مسلم اور غیر مسلم دونوں نے اعتراف کیا کہ اس سے بہتر ٹاؤن پلاننگ کا بنیادی خاکہ نہیں ہوسکتا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جہاں کوفہ بنایا جائے سب سے پہلے اس مجوزہ شہر کے مرکز کا تعین کرنا کہ اُس شہر کا مرکز کہاں ہوگا۔ جہاں مرکز ہو، وہاں اتنی بڑی جگہ (مجھے اس کی مقدار یاد نہیں) اتنے ہاتھ لمبی، اتنے ہاتھ چوڑی، مسجد کے لئے جگہ وقف کر دی جائے۔ شہر کا مرکز مسجد ہو۔ چوں کہ اسلام کے اس پیراڈائم میں، مرکزی کردار عقائد اور عبادات کا ہے، لہٰذا جو چیز مسلمانوں کے عقیدے کا سب سے بڑا مظہر ہے، جو عبادات کا سب سے بڑا مظہر ہے اس کو ٹاؤن پلاننگ کا سب سے بڑا مرکز ہونا چاہئے۔ یہ بات قرآن میں کہیں نہیں لکھی۔ حدیث میں کہیں نہیں آئی کہ اے مسلمانو! شہر بناؤ تو مسجد بیچ میں بناؤ۔ اس لئے کہ بعض اوقات شاید یہ ممکن نہ ہو، مسجد بیچ میں نہیں آ رہی ہو، بیچ میں پہاڑ آ رہا ہو، بیچ میں کوئی اور مسئلہ ہو رہا ہو۔ لیکن مسجد مسلمانوں کا یہ ہے کہ شہر ایسے بسایا جائے، شہر کا نقشہ اس طرح بنایا جائے۔ پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کے بعد اتنی جگہ کھلی چھوڑ دو، جو مسلمانوں کی اجتماعی ضرورتوں کے لئے ہو۔ یعنی جو Public Place ہو، جہاں مسلمان عید کے دن جمع ہوسکیں، جمعے کے دن بازار قائم کر سکیں، کسی اور موقع پر وہاں کوئی اجتماعی کام کرنا چاہیں تو وہ انجام دے سکیں۔ اس کے بعد کی جگہ بازار کے لئے چھوڑ دو، چاروں طرف بازار ہو، گویا مرکز، مسجد اور معاشری سرگرمی کا جو سب سے اہم سینٹر ہے، وہ مسجد اور اس کے قرب و

جوار کو ہونا چاہئے۔اب آپ غور کریں کہ مسلمانوں کے، جتنے بڑے بڑے شہر ہیں سب میں ایسا ہی ہے، ہر جگہ مسجد کو مرکزیت حاصل ہے،اس کے چاروں طرف بازار ہےاور مسلمانوں کے اجتماعی کاموں کا جو محل وقوع تھا وہی ہوا کرتا تھا۔سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ اس مسجد کے چاروں طرف چار بڑی سڑکیں نکالو۔ جو کم از کم اتنی چوڑی ہوں۔اور ایک بات انہوں نے فرمائی جس پر آج بھی عمل درآمد ہونا چاہئے ،انہوں نے کہا وہ جگہ اتنی ہو کہ جب دو اونٹ سوار،جن کے اونٹ پر بوجھ پورا لدا ہوا گزر رہے ہوں تو ایک اونٹ والا ادھر گزر سکے۔ ایک اونٹ والا ادھر سے گزر سکے اور دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لئے جگہ ہو۔میں آج کل کی زبان میں اس کا نتیجہ یہ نکالتا ہوں کہ چار رو پر مشتمل سڑک دونوں طرف ہونی چاہئے۔ ایک ٹرک جا سکے اور ایک ٹرک آ سکے،اور دونوں طرف دو چھوٹی گاڑیوں کی گنجائش ہو۔تو یہ چار حصے ہو گئے۔ان چار حصوں میں ہر حصے میں مرکز ایک مسجد ہو اور اس کو اسی طرح سے تقسیم کیا جائے۔آج تک کوئی شہر اتنے سائنٹیفک انداز میں ٹاؤن پلان نہیں ہوا، جتنا سیدنا عمر فاروقؓ نے کوفے کو بیان کیا تھا۔ یہ مثال میں نے اس لئے دی کہ یہ وہ معاملات ہیں جس میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں شریعت یا دین کے پیرا ڈائم کا کوئی اثر یا کردار نہیں ہے، لیکن یہ ہے کہ حقیقت شریعت کا کردار اس میں بھی ہے۔

علامہ اقبال کی ایک کتاب ہے، آپ میں سے جو لوگ فارسی جانتے ہیں ان کو میرا مشورہ ہوگا، کم از کم ایک دن بیٹھ کر کسی دن، چھٹی والے دن اس کی ورق گردانی کریں ''زبورِ عجم'' زبور عجم فارسی غزلیات کا مجموعہ ہے اُس کے آخر میں ایک چھوٹا سا ضمیمہ ہے، جس کا عنوان ہے ''بندگی نامہ'' یہ فارسی مثنوی میں ہے۔علامہ اقبال نے بندگی نامہ میں یہ بتایا ہے کہ غلاموں کی نفسیات کیا ہوتی ہیں؟ اور آزاد قوموں کی نفسیات کیا ہوتی ہیں۔اور اس میں ایک فصل ہے ''درفن تعمیر مردانِ آزاد'' کہ آزاد قومیں جب فن تعمیر اختیار کرتی ہیں تو اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں۔اور غلام قوم فن تعمیر اختیار کرتی ہے تو اس کا انداز کیا ہوتا ہے۔اس سے اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کے فن تعمیر کی دینی اہمیت کیا ہے؟

تاج محل کی کوئی دینی اہمیت اس اعتبار سے نہیں ہے کہ ایک خاتون کا مزار ہے۔ ویسے بھی شرعاً کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے کہ کسی عورت یا مرد کا مزار اتنا بڑا بنایا جائے۔لیکن فن

تعمیر کی حیثیت سے اُس میں خوبیاں کیا ہیں، اُس کا علامہ اقبالؒ نے ذکر کیا ہے۔اور یہ اشارہ کیا ہے کہ یہ مسلمانوں کے اسلامی مزاج کا ایک مظہر ہے کہ اُس میں یہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔آج کے فن تعمیر سے اُس کا مقابلہ کرلیں۔ میں اپنے موضوع سے ذرا ہٹ گیا۔لیکن آپ کسی پرانی مسجد میں جائیں، دہلی میں بڑی سخت گرمی ہوتی ہے، لاہور میں گرمی ہوتی ہے، بادشاہی مسجد میں اندر جا کر بیٹھیں، تو آپ کو پنکھے کی اور اے سی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ فن تعمیر ہے جو مسلمانوں نے ایجاد کیا۔ چوں کہ گرمی میں جمعہ کی نماز پڑھنی ہوگی، ظہر کی نماز بھی ادا کرنی ہوگی اور گرمی میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے لئے گرمی میں شاید لوگ آنے کے لئے تیار نہ ہوں، تو مسجد ایسی ٹھنڈی ہو کہ لوگ بے اختیار مسجد میں جانے میں آمادہ ہوں۔مسجد ایسی ہو جو مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرے کہ مسجد میں جائیں۔ یہ اسلامی فن تعمیر ہے۔آج کا فن تعمیر یہ ہے کہ اگر ایک گھنٹے کے لئے بجلی فیل ہوجائے تو کراچی کی آدھی عمارتیں خالی ہوجاتی ہیں۔آپ اس عمارت میں بیٹھ نہیں سکتے۔اس لئے کہ یہ اس علاقے کی نقل ہے جہاں سال میں ۱۰ مہینے برف پڑتی ہے، وہاں اس طرح کی عمارتیں بنتی ہیں۔وہاں بند عمارتیں بنتی ہیں اور دیواروں میں شیشے لگائے جاتے ہیں۔دیواروں میں شیشے لگائے جانے کی حکمت یہ ہے کہ جب کبھی سورج نکلے تو اس کی روشنی اندر آجائے، تاکہ سال میں دو چار گھنٹے کے لئے سورج نکلے تو اس کی روشنی سے مستفید ہوجائیں۔

ہمارے یہاں پہلے عمارتوں میں شیشہ لگایا جاتا ہے، پھر کروڑوں روپے خرچ کرکے اس کو ایئر کنڈیشن کیا جاتا ہے۔ پھر لاکھوں روپے ماہوار خرچ کرکے اس کو ٹھنڈا رکھا جاتا ہے۔ پہلے گرمی کو اندر آنے کا راستہ فراہم کرو، عمارت کو اندر سے گرم کرلو، جب گرم ہوجائے تو پیسے خرچ کرکے اس کو اندر سے ٹھنڈا کرو۔ایسی بے وقوف قوم شاید دنیا میں کہیں نہیں پائی جائے گی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب سے مرعوبیت ہے، اسلامی روایات سے انحراف ہے اور دوسروں کی ہدایات کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرنے کا اور اپنے اقدار سے دوری کا ایک جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔شریعت کا جو عمومی تبدیلی کا رجحان یا پیغام ہے، یہ بغیر کسی مقصد کے نہیں ہوسکتا، بغیر کسی حکمت کے نہیں ہوسکتا۔اس کے پیچھے ایک حکمت ہوگی تو یہ کام ہوگا ورنہ نہیں ہوسکتا۔

فقہائے اسلام میں حکمت پر بحث ہوتی رہی۔متکلمین میں بھی یہ بحث جاری رہی،

لیکن وہ بحث محض لفظی ہے، بحث یہ ہے اور خاص طور پر اشاعرہ اور معتزلہ میں یہ بحث بہت قدیم ہے، متکلمین اور علم کلام کے طلبہ اس بحث سے واقف ہیں۔ بحث یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے احکام مبنی بر حکمت ہیں، یا مبنی بر حکمت نہیں ہیں؟ کچھ حضرات کا کہنا یہ ہے کہ مبنی بر حکمت نہیں ہیں۔ کچھ حضرات کا اصرار ہے کہ مبنی بر حکمت ہیں۔لیکن یہ اختلاف محض لفظی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات مبنی بر حکمت نہیں ہیں۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی حکمت کا پابند نہیں ہے۔ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ پر کوئی بات لازمی نہیں کہ میرے یا آپ کے فائدے کے لئے کوئی قانون جاری کرے، اللہ تعالیٰ وہ مالک ومختار ہے وہ جو چاہے حکم دے۔نظری اعتبار سے یہ بات بالکل درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی حکمت یا مقصد کا نعوذ باللہ پابند نہیں ہے۔ اُس نے پانچ نمازوں کو حکم کیوں دیا، سات کا کیوں نہیں دیا؟ اس کی حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس پر ہم عمل درآمد کے پابند ہیں، اگر سمجھ میں آجائے تو بہت اچھا نہ سمجھ میں آئے جب بھی نمازیں پانچ کی چار نہیں ہوسکتیں، اور پانچ کی سات نہیں ہوسکتیں۔

اس لئے جن حضرات نے یہ اصرار سے کہا ہے کہ کوئی حکمت نہیں تلاش کرنی چاہئے انہوں نے اس نقطۂ نظر سے کہا ہے کہ یہ ایمان کے منافی ہے، یہ بات جذبہ ایمان سے ہم آہنگ نہیں ہے کہ پہلے میں کہوں کہ جی میں آپ کے حکم پر عمل درآمد کروں گا، لیکن پہلے مجھے حکمت بتادیں کیا ہے؟ تو یہ رویہ اللہ تعالیٰ پر بے چوں چرا ایمان یا امتثال امر کے منافی ہے۔ ایک خالص صاحبِ ایمان اور مسلمان کے نقطۂ نظر سے یہ بات بالکل درست ہے۔ اور جن علماء نے یہ بات لکھی بالکل درست لکھی کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں حکمت اور مصلحتیں تلاش کرنا ایک صحیح جذبہ ایمانی سے ہم آہنگ نہیں ہے۔لیکن کچھ حضرات نے بہت تیقن اور شدت کے ساتھ اِس بات کو بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں ایک حکمت اور مصلحت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا کسی نعوذ باللہ مجبوری کے تحت نہیں کیا، بل کہ اس نے خود اپنے اوپر یہ لازم قرار دیا کہ وہ بغیر حکمت یا مصلحت کے کوئی حکم نہیں دے گا۔ یہ بحث شروع میں دو، تین سو سال رہی، متکلمین میں دونوں نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔

جو متکلمین اشاعرہ کے نقطۂ نظر کے زیادہ علم بردار ہیں انہوں نے بہت زور وشور

سے یہ بات لکھی ہے، مثلاً امام رازیؒ نے۔امام رازی کا قلم تو ان کے طلبہ جانتے ہیں جب وہ کسی چیز کو ثابت کرنے پر آتا ہے تو جس چیز کو چاہیں ثابت کر دیں۔اور جب تردید کرنے پر آتا ہے تو جس چیز کی چاہیں تردید کر دیں۔انہوں نے یہ بات اتنے زور وشور سے لکھی ہے کہ اُس سے زیادہ زور وشور سے اِس مسلک کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔لیکن خود امام رازی ہی نے جا بہ جا اپنی تفسیر میں اور دوسری کتابوں میں احکام قرآنی کی جہاں جہاں حکمتیں آئی ہیں ان کو بیان کیا ہے۔گویا حکمتوں کے وجود پر تو اختلاف نہیں ہے، حکمتوں کے لزوم پر اختلاف ہے۔لزوم کا کوئی قائل نہیں ہے۔نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ پر تو کوئی چیز لازم یا واجب نہیں ہے۔تو یہ محض نظری بحث ہے۔اس کو کسی کتاب میں دیکھ کر متاثر نہ ہوئیے گا کہ قرآن میں حکمتوں کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔حکمتوں کے وجود میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وجوب میں اختلاف ہے۔ وجوب یا لزوم میں۔ وجوب بالبا مختلف فیہ ہے، وجود بالدال مختلف فیہ نہیں۔(یعنی اس کے واجب اور لازم ہونے میں تو اختلاف ہے،اس کے وجود یا پائے جانے میں کوئی اختلاف نہیں) یہ بات کہ قرآنِ پاک اور سنت کے احکام میں حکمتیں ہیں۔ یہ تو خود قرآن کے صفحے صفحے سے ظاہر ہے، اور خود قرآنِ پاک کا مہیمن ہونا، اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ قرآن پاک میں ہر شرعی حکم کی کوئی نہ کوئی حکمت بیان کی گئی ہے۔قرآن پاک نے یہ کہا ہے کہ وہ تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق بھی کرتا ہے اور اُس پر مہیمن بھی ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ(۱۰)

تمام آسمانی کتابوں کا مصدق بھی ہے اور مھیمن بھی ہے۔

مہیمن کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کی پوری روح کو اور ان کے تمام اساسی مندرجات کو قرآنِ پاک اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔تورات کا اساسی محتویٰ کیا تھا۔تورات کا اساسی محتویٰ قانون ہے۔تورات کے لغوی معنی عبرانی زبان میں قانون کے ہیں۔گویا قانون الٰہی اپنی خالص شکل میں تورات میں موجود ہے۔تورات میں کسی قانون کو بیان کرتے ہوئے اس کی حکمت یا مصلحت کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہودیت میں ایک حرفیت اور ظاہر پرستی پیدا ہوگئی۔ظاہر پرستی اور حرفیت کا سدِ باب کرنے کے لئے سیدنا عیسیٰؑ تشریف

۱۰۔ المائدہ:۴۸

لائے۔ان کے پیغام میں پیغام الٰہی کی حکمت اور روح پر زیادہ زور دیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں نے پیغام شریعت کو منسوخ کردیا۔سینٹ پال نے جس مسیحیت کو فروغ دیا، اُس میں پہلا کام یہ کیا کہ قانون تورات منسوخ کردیا۔اب قانون توراۃ عیسائیوں کے لئے نظری طور پر تو قانونِ الٰہی ہے، عملی طور پر قانون الٰہی نہیں ہے۔عملی طور پر عیسائیوں کے پاس کبھی بھی کوئی قانون الٰہی نہیں رہا، سینٹ پال سے لے کر آج تک ایک دن کے لئے بھی نہیں رہا، قرآنِ مجید میں یہ دونوں چیزیں یک جا کردی گئیں ہیں۔احکام الٰہی بھی اپنی مکمل شکل میں دیئے گئے۔جو جو چیزیں تورات میں نہیں آئیں تھیں یا تورات میں غلط سمجھی گئیں یا ان میں تحریف ہوئی یا حذف کردی گئیں، وہ ساری قرآنِ پاک میں بیان کردی گئیں۔اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے آخری زمانے کے لئے اٹھا رکھی تھیں وہ بھی آگئیں۔اور اُن میں سے ہر حکم کی حکمت اور مصلحت بھی آگئی۔چناں چہ قرآن مجید میں آیاتِ احکام میں سے ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس میں حکم سے پہلے یا حکم کے بعد اس کی حکمت نہ بیان ہوئی ہو۔قصاص کا حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتقُوْنَ (۱۱)

اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے، اے عقل والو، تاکہ تم بچو۔(محفوظ رہو)

یعنی تمہاری زندگی کا بندوبست کرنے کے لئے قصاص کے احکام دیئے جارہے ہیں۔

اسی طرح دوسرے مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ تمہارے اندر تزکیہ پیدا کرنے کے لئے صدقے کا حکم دیا جارہا ہے۔تمہیں شعائر اللہ کی یاددہانی کرنے کے لئے حج کا حکم دیا گیا ہے۔ پورے قرآن کریم کا آپ جائزہ لے لیں، ہر جگہ آپ کو اس کی مثالیں ملیں گی۔یہی بات احادیث میں بھی آئی ہے۔لیکن یہ حکمتیں جزوی حکمتیں ہیں جو ہر حکم کے ساتھ جابجا بیان ہوئی ہیں۔

قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ قرآن مجید کسی فلسفے کی کتاب کے انداز میں یا کسی کلام کی کتاب کے انداز میں مسائل سے بحث نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ صرف امام رازی، اور غزالی کے لئے نہیں اُترا۔اگر صرف غزالی اور رازی اس کے مخاطب ہوتے تو شاید یہ اسلوب مفید

۱۱۔ البقرہ:۱۷۹

ہوتا۔ لیکن قرآن پاک میرے اور آپ کے لئے بھی اُترا ہے، ان کے لئے بھی اترا ہے جو کلام اور فلسفے سے واقف نہیں ہیں، ان کے لئے بھی اترا ہے جو اصولِ فقہ اور قانون کے مباحث سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے قرآن مجید میں ہر بات اتنے آسان انداز میں کہی گئی ہے کہ غزالی اور رازی و شاطبی اور قرافی اپنی سطح پر اس کو سمجھتے ہیں اور اس سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک عام مسلمان جو اپنی سطح پر سمجھنا چاہتا ہے اس کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، اس لئے قرآنِ مجید کا اسلوب ایک منفرد انداز کا اسلوب ہے جس سے ہر شخص اپنی سطح پر کسب فیض کرسکتا ہے۔

قرآن حکیم بہ یک وقت لاکھوں سطحوں پر، کروڑوں سطحوں پر مخاطب ہوتا رہتا ہے۔ قرآن جس طرح ایک وقت میں لاکھوں سطح پر لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے، کوئی اور کتاب نہیں ہوتی۔ دیوانِ غالب کو دیکھ لیں، آپ کراچی کے ایک کروڑ آبادی میں شاید نناوے لاکھ، ننانوے ہزار ایسے ہوں جو اس کو نہ سمجھ سکیں، اس لئے کہ وہ اُن سے مخاطب ہی نہیں ہوتا وہ تو چند محدود لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ قرآن پاک کا یہ اسلوب نہیں ہے، وہ ہر انسان سے مخاطب ہوتا ہے۔ ٹیکسی اور رکشہ ڈرائیور سے لے کر غزالی و رازی و شاطبی و قرافی اور ابوحنیفہ و مالک بن انس ہر ایک سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ایک اپنی سطح پر اُس سے رہ نمائی لیتا ہے۔ گویا کہ یہ ایسا پاور ہاؤس ہے جس میں مختلف پاور کے پلگ پوائنٹ بنے ہوئے ہیں۔ آپ جس طرح کی پاور لینا چاہیں اُس طرح کا پلگ وہاں لگالیں۔ جو پاور چاہیں گے وہ آپ کو مل جائے گی۔ بہت بڑی پاور بھی ملے گی، بہت بڑی ملے گی۔ فیکٹریاں چلانے والی بھی ملے گی، ملک کو روشن کرنے والی بھی ملے گی۔ اور حجرہ روشن کرنے والی پاور بھی مل جائے گی۔

اس لئے قرآن پاک کا اسلوب اُس طرح کا نہیں ہے کہ اس میں کلیات بیان ہوئے ہیں۔ کلیات سے عام آدمی کو دل چسپی نہیں ہوتی، آپ ایسے کلیات عام آدمی سے بیان کریں گے وہ تو دل چسپی نہیں لے گا۔ وہ جزئیات سے زیادہ دل چسپی رکھتا ہے، اس کو جزئیات بتانا زیادہ مفید ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور کو صرف یہ بتانا کافی ہے کہ لال بتی ہو تو فلاں طرف نہیں مڑنا۔ بس، کیوں نہیں مڑنا اس میں حکمت کیا ہے؟ مڑو گے تو کیا ہوگا؟ نہیں مڑو گے تو کیا ہوگا؟ اس سے اُسے بحث نہیں ہوگی۔ اور اگر آپ اس بحث میں اُس سے پڑیں گے تو ٹریفک

کے قوانین کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔اس لئے ہر انسان کی ایک سطح ہوتی ہے، اُس سطح پر اُس سے معاملات کو طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات میں کوئی نئی نہیں کہہ رہا، یہ صحابہ کرام کے زمانے سے یہ بات چلی آ رہی ہے:

کلموا الناس علی قدر عقولھم

لوگوں سے ان کی ذہنی سطح کے مطابق کلام کیا کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس انداز سے حضراتِ شیخین سے اور عشرہ مبشرہ سے گفت گو فرماتے تھے اُس انداز سے ایک عام صحابی سے گفت گو نہیں کرتے تھے۔ بدو صحابی کہتے تھے خدا کی قسم! میں نہ کم کروں گا نہ زیادہ کروں گا:

لا ازید فیھا و لا انقص

جو کہہ دیا اُس پر عمل کروں گا، آپ نے فرمایا کہ اگر ان سے سچ کہا تو یہ اہلِ جنت میں سے ہے۔ حال آں کہ وہ صحابی صرف پانچ چیزیں سُن کر گئے تھے کہ نماز پڑھنی ہے زکوٰۃ دینی ہے، روزہ رکھنا ہے اور کلمہ پڑھنا ہے اور حج کرنا ہے۔اس پر قسم کھا کے کہا:

واللہ لا ازید فیھا و لا انقص

آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص اہلِ جنت میں سے ہے۔اس لئے کہ اُس سطح پر یہ کافی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک نے مقاصدِ شریعت اور اہداف شریعت کو کسی فلسفے کے یا کسی نظامِ حکمت کے انداز میں بیان نہیں فرمایا۔اس لئے کہ وہ عام آدمی کے لئے غیر ضروری ہے۔وہ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی غیر ضروری ہے۔اُس کی وجہ یہ ہے کہ علم وفکر کی سطحیں ہوتی ہیں، ایک سطح تو عام انسان کی ہوتی ہے کہ جو دین کا ضروری علم جان لے وہ کافی ہے۔ اُس کو اُس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ایک سطح ہوتی ہے کہ شریعت کے ایسے علماء یا ماہرین ہوں، جو عامۃ الناس کی رہ نمائی کر سکیں۔ یہ درمیانی سطح ہوتی ہے، اس سطح پر مقاصد الشریعۃ کا علم ہونا چاہئے۔ایک بہت اونچی سطح ہوتی ہے جو علمائے کرام کی رہ نمائی کر سکے۔علماء کی بھی تو رہ نمائی چاہئے۔اُس سطح میں پھر کتنی سطحیں ہیں وہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ایک ابوحنیفہ کی سطح ہے۔اُس سے نیچے کے لوگوں کی سطح ہے اُس سے نیچے لوگوں کی، ہزاروں لاکھوں سطحیں اُس سے نیچے چلیں آ رہی ہیں۔ ہر سطح کا عالم اپنی سطح پر حکمت شریعت اور مقاصد شریعت کو سمجھتا

چلا گیا۔اور وہ فہم آج تک جاری ہے اور یہ سلسلہ فہم و تحقیق بھی ختم نہیں ہوگا۔جیسا کہ میں نے قرآنِ پاک کی آیات کے حوالے سے کہا تھا:

حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَق (۱۲)

تا آں کہ سب انسانوں کو یقین ہو جائے کہ یہی حق ہے۔

اُس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ چناں چہ مقاصد شریعت پر گفت گو کا عمل، صحابہ کرامؓ کے زمانے سے شروع ہوا، تابعین نے اِس سلسلے کو جاری رکھا اور بعد کے سارے ادوار میں یہ سلسلہ جاری رہا۔

قرآنِ مجید میں جو مقاصد بیان کئے گئے ہیں وہ دو طرح کے مقاصد ہیں۔ کچھ مقاصد تو وہ ہیں جن کو آپ عمومی اہداف کہہ سکتے ہیں۔مثلاً قرآنِ پاک میں عدل کا ذکر ہے، ایک جگہ آیا ہے کہ ہم نے ساری شریعتیں اور ساری کتابیں اس لئے اتاریں اور سارے پیغمبر اور رسول اس لئے بھیجے:

لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۱۳)

تا کہ لوگ قسط پر یعنی حقیقی عدل وانصاف پر قائم ہو جائیں۔

گویا عدل و انصاف اور قسط یہ ساری شریعت کا اور ساری آسمانی کتابوں کا مقصد اولین ہے۔ایک جگہ احسان کا ذکر ہے، ایک جگہ انسان کی کرامت کا ذکر ہے:

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۴)

آدم کی اولاد کو ہم نے مکرم قرار دے دیا۔

یہ بیان صیغۂ ماضی میں ہے، جو تاکید کے لئے ہوتا ہے۔ کچھ اہداف اور مقاصد تو اس طرح کے ہیں۔ کہ قرآنِ پاک میں یہ بتا دیا گیا کہ شریعت کے احکام دراصل ان مقاصد کے حصول کے لئے ہیں۔ان مقاصد پر عمل کرو گے، تو عدل قائم ہوگا، ان احکام پر عمل کرو گے تو کرامتِ آدم کا مقصد کا پورا ہوگا۔ان احکام پر عمل کرو گے تو مساوات پیدا ہوگی۔ کچھ مقاصد

۱۲۔ حم السجدہ:۵۳

۱۳۔ الحدید:۲۵

۱۴۔ بنی اسرائیل:۸۰

شریعت میں ایسے بیان کئے گئے ہیں کہ جو مقاصد تو کہے جا سکتے ہیں لیکن دراصل وہ مقاصد نہیں ہیں ۔ بل کہ وہ رہ نما ہدایات ہیں کہ احکام شریعت کی روشنی میں جب مزید اجتہاد اور استنباط کرو، جب اجتہاد کے نتیجے میں یا افتا کے نتیجے میں مزید احکام کی دریافت کرو تو تمہارے سامنے رہ نما اُصول کون سے ہونا چاہئیں؟ مثال کے طور پر ایک جگہ آیا ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِي الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ (۱۵)

ہم نے دین میں کوئی حرج نہیں رکھا۔

یہ بات قرآن حکیم میں کئی جگہ بیان ہوئی ہے۔ اب حرج پر ایک لمبی گفت گو ہے، میں اُس میں نہیں جاتا کہ اُس سے کیا مراد ہے؟ کن صورتوں میں حرج کو حرج سمجھا جائے گا؟ کن صورتوں میں نہیں سمجھا جائے گا۔ ایک جگہ حدیث میں آیا ہے کہ یسر ہونا چاہئے:

ان هذا الدين يسر (۱۶)

بلاشبہ یہ دین تو سراپا آسانی ہے۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

يسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا (۱۷)

آسانی کرو اور تنگی مت کرو، اور خوش خبری دو اور متنفر مت کرو۔

اب یسر کا خیال رکھنا انسانوں کے لئے آسانی پیدا کرتا ہے۔ بشرا ولاتعسرا پہ عمل کرنا، یسرا ولاتعسرا کو یقینی بنانا فی نفسہٖ کوئی ہدف نہیں ہے۔ تھوڑا سا غور کریں فی نفسہٖ ہدف تو عدل ہے۔ کرامت آدم ہے۔ اس کی ضرورت تو اس وقت پیش آئے گی، جب آپ ہدف کی طرف چلیں گے اور راستے میں آپ کو کوئی ذیلی ہدایات دینے کی ضرورت پیش آئے گی، نئے احکام نئے مسائل کے احکام نکالنے کے لئے آپ اجتہاد کریں گے، افتا کا کام کریں گے تو آپ کو یہ دیکھنا چاہئے کہ یسر پیدا ہو رہا ہے کہ عسر پیدا ہو رہا ہے۔ حرج تو پیدا نہیں ہو رہا۔

۱۵۔ الحج: ۷۸

۱۶۔ البانی۔ السلسلۃ الصحیحۃ: ج ۳، ص ۱۵۰، رقم ۱۱۶۱

۱۷۔ احمد: ج ۶، ص ۶۵، رقم ۱۹۹۸۰ء

☆ ابوداؤد: ج ۴، ص ۳۴۱، رقم ۴۸۳۵

شریعت احکام حرج کے بارے میں کیا ہیں؟ یسر کے بارے میں کیا ہیں، مشقت کے بارے میں کیا ہیں۔اس پر بڑی لمبی بحثیں ہیں۔یسر، حرج اور مشقت وغیرہ پر طویل گفت گو ہے۔یہ رہ نما اصول ہیں، ان کو آپ اصول تقنین کہہ سکتے ہیں، یا اصول تشریع کہہ سکتے ہیں یا اسلام کی حکمت تشریع کہہ سکتے ہیں کہ شریعت کے مطابق قوانین کی تیاری یا نئے احکام کے استدلال و استنباط کے رہ نما اصول کیا ہونے چاہئیں؟ وہ یہ ہیں۔ان کا تعلق بھی مقاصدِ شریعت سے ہے۔ لیکن بالآخر جن معاملات کو مقاصدِ شریعت قرار دیا گیا، جن پر آگے چل ان شاءاللہ تفصیلی بات ہوگی، وہ پانچ ہیں۔ان پانچ کا تعین کب ہوا؟ کس غور وخوض کے نتیجے میں ہوا؟ اس غور وخوض میں کس طرح کے مسائل زیرِ بحث آئے؟ یہ تو ایک بہت لمبی گفت گو ہے، جو کام چودہ سو سال میں ہوا ہو، اس کو چودہ گھنٹے میں بھی بیان نہیں کیا جاسکتا۔لیکن جیسے جیسے فقہائے اسلام ان معاملات پر غور کرتے گئے، ان کے سامنے یہ نقشہ واضح ہوتا گیا کہ شریعت نے تین قسم کے مقاصد سامنے رکھے ہیں۔

کچھ مقاصد تو وہ ہیں جو بالآخر الٹی میٹ مقاصد ہیں، یعنی آپ ان کو کہہ سکتے ہیں The Ultimate objective جیسے عدل یا مساوات یا کرامتِ آدم، لیکن ابھی میں نے عرض کیا کہ بعض چیزیں ہوتی ہیں کہ انہیں کوانٹی فائی کرنا مشکل ہوتا ہے۔اور ان کا مکمل اور کُلّی اعتبار سے تعین دشوار ہوتا ہے۔یعنی میں یہ کہوں کہ کرامتِ آدم کا اس طرح مقصد پورا ہوگا بڑا مشکل ہے۔ممکن ہے میری رائے میں پورا ہوگیا ہو، آپ کی رائے میں پورا نہ ہوا ہو۔اس لئے فقہائے اسلام نے ان کو مقاصد قرار نہیں دیا۔یہ شریعت کے بنیادی اہداف تو ہیں اور ان کا حصول لازمی ہے، ہر شخص کو اس کے لئے پیش رفت جاری رکھنی چاہئے۔لیکن جن اُمور کو فقہائے اسلام نے مقاصدِ شریعت قرار دیا ہے وہ یہ نہیں ہیں۔اس لئے کہ یہ کوانٹی فائل نہیں ہیں۔دعویٰ کرنے کو تو آج عیسائی بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم انسانیت سے محبت کرتے ہیں، لیکن انسانیت سے محبت کا کوئی پیمانہ ان کے پاس نہیں ہے۔انسانیت سے محبت جیسے افغانستان میں ہورہی ہے اور عراق میں ہورہی ہے اور جگہ جگہ ہورہی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ڈھائی تین سو برس سے دنیائے اسلام میں ہورہی ہے۔انسانیت سے محبت کے وہ مظاہر آپ کے سامنے ہیں۔دنیائے مغرب آج کرامتِ آدم کے علم بردار ہے، مگر جیسی کرامتِ آدم گوانتا

ناموبے میں ہورہی ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ یہ سب اپنے آپ کو Rule of Law کے علم بردار کہتے ہیں، جیسا Rule of Law دنیا بھر میں ہورہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں بہ طور ایک نعرے کے سامنے رہیں، بہ طور ایک قوت محرکہ کے سامنے رہیں۔ اُس حد تک تو درست ہیں لیکن کسی موقع پر تیقن کے ساتھ یہ کہنا کہ یہ تقاضا پورا ہوگیا، بڑا دشوار ہے۔ اس لئے فقہائے اسلام نے مقاصدِ شریعت کی تفصیل میں ان کو شامل نہیں رکھا۔

آج بعض حضرات وقتاً فوقتاً یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فقہائے اسلام نے مقاصد شریعہ میں عدل کو تو شامل نہیں کیا۔ ایک بزرگ نے بہت زور وشور سے یہ بات لکھی ہے کہ امام غزالیؒ اور رازیؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ اور شاطبیؒ اور قرافیؒ یہ اتنے بڑے بڑے نام ہیں کہ ان میں سے ایک ایک کی مثل دنیائے غیر اسلام میں موجود نہیں ہے۔ اسلامی دنیائے اسلام سے باہر کی دنیا ان میں سے ایک کی بھی مثال بھی پیش نہیں کرسکتی، ان سب حضرات نے اتفاق رائے سے جو بعض مقاصد قرار دیئے ہیں اُن میں سے مثلاً عدل کو نہیں لکھا۔ اب یا تو آپ کہیں کہ یہ تمام لوگ اتنے بے وقوف تھے کہ ان کو عدل کی سمجھ میں نہیں آئی۔ یا اتنے سادہ لوح تھے کہ ان کو پتہ نہیں چلا کہ عدل بڑا اہم ہے اور اس کو شامل ہونا چاہیئے۔ یا شریعت کا اتنا کم علم رکھتے تھے، کہ وہ اصل بات تک نہ پہنچ سکے۔ حال آں کہ اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کرتا کہ شریعت کا ان کا علم کتنا تھا۔ شریعت بھی وہی ہے جو انہوں نے سمجھی۔ اس کی وجہ میرے ناچیز ذہن میں یہ آتی ہے کہ انہوں نے مقاصد شریعت ان معاملات کو قرار دیا جو بہت واضح ہوں، ڈیفائن ایبل (Definable) ہوں، کوانٹی فائی ایبل ہوں، جس کو ایگزیکٹلی چیوٹ کے ساتھ یعنی مکمل کمی اور کیفی کمال کے ساتھ بیان کیا جاسکے۔ جس میں نہ کمی کا امکان ہو، نہ بیشی کا امکان ہو۔

یہ مقاصد پانچ ہیں:

۱۔ سب سے پہلے تحفظ دین

۲۔ اس کے بعد تحفظ نسل، جس کے لئے فقہائے اسلام نے نفس کی اصطلاح استعمال کی، چوں کہ قرآن پاک میں نفس کی اصطلاح آئی ہے، احادیث میں نفس کی اصطلاح آئی ہے اس لئے انہوں نے نفس کی اصطلاح استعمال کی۔

۳۔ اس کے بعد تحفظ عقل

۴۔ اس کے بعد تحفظ نسل

۵۔ اس کے بعد تحفظ مال

اس پر تفصیلی گفت گو آگے چل کر ہو گی، ان شاء اللہ۔

یہ پانچ وہ مقاصد ہیں جن میں سے کسی ایک کو اگر زک پہنچے تو آپ تعین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں یہاں دین کے تحفظ کا تقاضا مجروح ہوا ہے۔ یا اگر ان میں سے کوئی مقصد حاصل ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہاں دین کے تحفظ کا تقاضا ایک قدم آگے بڑھا ہے۔ یہاں دین کا تحفظ ہو گیا ہے، یہاں جان کا تحفظ ہو گیا ہے۔ کوئی اختلاف نہیں کرے گا کہ جان کا تحفظ ہو گیا ہے۔ لیکن عدل کا تقاضا کب پورا ہوا؟ کتنا رہ گیا؟ کتنا نہیں رہا؟ اس میں دو رائیں ہمیشہ رہیں گی۔ ہمیشہ دو آدمی دو رائے دیں گے۔ اس لئے فقہائے اسلام نے ان کو اس نقطۂ نظر سے مقاصد قرار نہیں دیا۔ ان مقاصد کے تعین میں صدرِ اسلام کے فقہا نے تفصیل سے غور و خوض کیا ہے۔ اس غور و خوض مقصد یہ تھا کہ قرآنِ پاک اور احادیث میں جتنے احکام دیئے گئے ہیں اُن میں سے ایک ایک کر کے اگر غور کیا جائے، تو اُن میں سے ہر حکم کا بالواسطہ یا بلا واسطہ تعلق کسی ایک سے ہے۔ بلا شبہ عدل سے سب کا تعلق ہے یا اکثر کا تعلق ہے۔ کرامتِ آدم کا اکثر سے تعلق ہے۔ لیکن وہ تعلق کتنا ہے، کب ہے؟ وہ بات محلِ بحث ہے۔ لیکن ان پانچ مقاصد سے ہر ایک کا یا اکثر کا تعلق عدل وغیرہ سے بالواسطہ، یا بلا واسطہ پایا جاتا ہے۔

پھر ایک بات اور ذہن میں رکھئے گا کہ شریعت کے احکام کی بنیادی قسمیں دو ہیں۔

ایک قسم تو وہ ہے جو بالکل قطعی الثبوت ہے۔ جس کے شریعت کا حکم ہونے پر کسی صاحب ایمان کو ئی ذرہ برابر شبہ نہیں ہے کہ وہ شریعت کا حکم ہے اور قطعی الثبوت ہے۔ جس کا منکر دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے۔

اور احکام شریعت کی دوسری قسم وہ ہے جو ظنی الثبوت ہے، جس کے ثبوت میں دو رائے ہو سکتی ہیں۔ آپ رفع یدین کریں یا نہ کریں مختلف فیہ بات ہے۔ آپ کے خیال میں یہ بات درست ہے کہ کرنا چاہئے تو آپ کریں۔ آپ کے خیال میں یہ رائے درست ہے کہ نہیں کرنا چاہئے تو نہ کریں۔ دلائل اُدھر بھی ہیں، اِدھر بھی ہیں۔ قوی دلائل کہاں ہیں؟ اس کا تعلق رائے پر ہے۔ اور یہ ظنی الثبوت بات ہے۔

شریعت کا بیشتر حصہ قطعی الثبوت ہے۔ یہ سمجھنا کہ ظنی الثبوت حصہ زیادہ ہے صحیح نہیں ہے۔ظنی الثبوت مشکل سے ایک فیصد ہے۔شریعت کا ننانوے فیصد حصہ قطعی الثبوت ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ جو قطعی الثبوت ہے وہ قطعی الثبوت کیوں ہے؟ قطعی الثبوت کی بہت سی قسمیں ہیں جس کی تفصیل میں جانے کا اس وقت موقع نہیں۔لیکن قطعی الثبوت کا سب سے بنیادی اصول ہے تواتر۔یعنی جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے تواتر کے ساتھ چلی آرہی ہے، وہ مسلمانوں میں قطعی الثبوت ہے،اور تواتر جتنا قوی ہوتا ہے اس کے جو ظاہری تقاضے ہیں،اُتنے غیر ضروری ہوجاتے ہیں۔ یہ بات میں ذرا احتیاط سے کہتا ہوں۔ جو حصہ تواتر کی جتنی قوت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے جزوی شرائط اور ذیلی تقاضے اتنے ہی کم ہوجاتے ہیں۔تواتر کا سب سے مضبوط اور قوی ترین حصہ ہے تواتر طبقہ، کہ ایک چیز صحابہ کرام کو بہ حیثیت طبقے کے ملی، پوری جماعت صحابہؓ نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا۔اور پوری جماعت صحابہ نے پوری جماعت تابعین کو منتقل کردیا۔ پوری جماعتِ تابعین نے پوری جماعتِ تبع تابعین کو منتقل کردیا۔ یہ تواتر طبقہ ہے۔ جو تواتر کی اعلیٰ ترین قسم ہے، جیسے قرآنِ پاک ہے۔قرآنِ پاک تواتر طبقہ سے ثابت ہے۔قرآنِ پاک کی کوئی انفرادی سند نہیں ہے کہ حدثنا فلان عن فلان عن فلان جو کسی ایک صحابی پر جا کے ختم جاتی ہو۔قرآن اس طرح کی سند سے ہم تک نہیں پہنچا۔قرآن پاک تو ایک طبقے نے دوسری نسل کو، دوسری نے تیسری کو،تیسری نے چوتھی نسل کو پہنچایا۔سنت کا بیشتر حصہ اسی تواتر طبقہ سے پہنچا ہے۔ جو چیزیں قرآنِ پاک میں آئی ہیں اس تواتر کی اعلیٰ ترین شکل میں ہے،اس میں پھر دو طرح کے احکام ہیں۔ کچھ احکام وہ ہیں جو قطعی الدلالت ہیں، کچھ احکام وہ ہیں جو ظنی الدلالت ہیں۔ کچھ احکام تو وہ ہیں جو قرآنِ پاک میں اتنے وضاحت کے ساتھ ہیں کہ اُس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں۔ وہ قطعی الدالت ہیں۔قرآن پاک میں آیا ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا o (۱۸)

اور لوگوں پر اللہ کے لئے اس گھر کا حج فرض ہے جو وہاں پہنچنے کی طاقت رکھتے ہوں۔

۱۸۔ آل عمران:۹۷

اب بیت سے کیا مراد ہے؟ کوئی یہ کہے کہ یہ بیت مراد ہے جہاں ہم موجود ہیں،تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ اس آیت میں بیت سے مراد یہ کمرہ ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، اس بات میں کوئی مسلمانوں میں اختلاف نہیں ہے، سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے زمانے سے آج تک کوئی اختلاف نہیں رہا۔اس لئے کہ البیت ایک قطعی چیز ہے، معلوم ہے کہ اس سے وہ گھر مراد ہے جو سیدنا ابراہیم نے مکے میں بنایا تھا:

لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ o(۱۹)

وہی ہے جو مکے میں ہے، وہ برکت والا ہے اور دنیا بھر کے لئے رہ نمائی کا ذریعہ ہے۔

یہ ہے قطعی الثبوت۔قطعی الثبوت کی ایک قسم علمائے اصول نے یہ لکھی ہے کہ قرآنِ پاک کی بے شمار نصوص سے ایک حکم نکلتا ہو۔جس میں متعین کسی ایک نص پر دارو مدار نہ ہو، بل کہ قرآنِ پاک کی سیکڑوں نصوص سے ایک حکم نکلتا ہو، یا احادیث کی سیکڑوں روایات سے کوئی حکم نکلتا ہو،اور مجموعی طور پر وہ حکم قطعی طور پر ثابت شدہ ہو،اس کو بھی قطعی الثبوت کہا جائے گا۔ مثال کے طور پر، احادیث میں اس کی مثالیں جو علمائے اصول حدیث نے دی ہیں وہ کہتے ہیں جیسے دعا میں رفع یدین کی احادیث ہیں، رفع یدین نماز والا نہیں، جب دعا کی جائے تو ہاتھ اُٹھا کے دعا کی جائے۔کوئی ایک حدیث تو ایسی نہیں ہے جو متواتر ہو، کہ کسی صحابی نے روایت کی ہو کہ رسول اللہ دعا میں ہاتھ اٹھایا کرتے تھے، جب دعا فرماتے تو ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔بل کہ سیکڑوں صحابہ نے الگ الگ مختلف واقعات بیان کئے ہیں۔کسی نے بیان کیا کہ رسول اللہ میرے گھر تشریف لائے تو انہوں نے کہا،عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لئے دعا کریں،تو آپ نے دستِ مبارک اٹھایا:

حتیٰ یری بیاض ابطیه

حتی کہ آپ کے دستِ مبارک کی سفیدی اور گورا رنگ محسوس ہوا۔

مثلاً فلاں موقع پر آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، اس طرح کے متفرق واقعات میں ہاتھ اٹھانا دعا کے ساتھ اتنے تواتر سے ثابت ہے کہ یہ بات قطعی الثبوت ہے۔قرآنِ پاک کی

۱۹۔ آل عمران:۹۶

بے شمار نصوص میں اور بے شمار احادیث میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان میں ایک ایک الگ الگ جائزہ لیا جائے تو اس کا یا تو آخری ہدف دین کا تحفظ ہے، یا نفس کا تحفظ ہے، یا عقل کا تحفظ ہے یا نسل کا تحفظ ہے یا مال کا تحفظ ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور چیز کا تحفظ شریعت کے کسی حکم کا مقصود نہیں۔

ان مقاصد شریعہ پر پہلے استقرائی منطق کے اصول پر غور شروع ہوا۔ منطق استقرائی یہ ہے کہ آپ جزئیات کا جائزہ لیں، اور جزئیات کا جائزہ لینے کے بعد آپ ایک کلی اصول پر پہنچ جائیں، جو ان جزئیات کو منضبط کرتا ہو تو ایک کلی اصول معلوم ہو جائے گا۔ ہمیں اصول معلوم ہے کہ جو سنکھیا کھائے وہ مرجاتا ہے۔ اصول کیسے پتہ چلا؟ بیس تیس آدمیوں کے بارے میں سنا کہ سنکھیا کھایا اور مر گئے۔ تو اگر بیس مر گئے، تو اکیسواں بھی مر جائے گا، تو میں وہ اکیسواں کیوں بنوں، اس لئے میں سنکھیا نہیں کھاتا۔ گویا جزئیات سے کلیات معلوم ہو جاتے ہیں۔ بجلی کے ننگے تار کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، اس لئے کہ بیسیوں آدمیوں کو دیکھا کہ جس نے تار کو ہاتھ لگایا اس نے نقصان اٹھایا۔ یا زخمی ہوا یا مر گیا یا اس کو نقصان پہنچا۔ تو جزئیات سے کلیات کا استنباط کرنا یہ منطقی استقرائی کہلاتا ہے۔ فقہائے اسلام نے منطق استقرائی سے کام لیا۔ اور قرآنِ پاک کے احادیث کے جزوی احکام سے کلیات دریافت فرمائے۔ پھر انہوں نے منطق استخراجی سے جو یونانیوں کی دین ہے کہ کلیات سے جزئیات پتہ لگائیں پھر اُن کلیات کو دوبارہ قرآن پاک اور احادیث کے احکام پر منطبق کر کے دیکھا۔ اگر وہی نتیجہ نکلتا ہے تو نتیجہ درست ہے، استقرا سے ادھر جائیں تو وہ کلیہ نکلتا ہے، کلیئے سے ادھر آئیں تو وہ جزئیہ نکلتا ہے تو دونوں کا ربط واضح ہو گیا۔ اس لئے یہ پانچ کلیات سامنے آئے۔ انفرادی طور پر تو بہت سے فقہا نے، جس میں صحابہ کرام بھی شامل ہیں، جن کو فقہا کہنا کم از کم مجھے اپنے ذوق پر ناگوار گزرتا ہے۔ فقہا تو ان کے کاسہ لیس اور تلامذہ ہیں، صحابی کا درجہ تو ہر ایک سے اونچا ہے۔ اس لئے صحابی کے لئے فقیہ کا لفظ استعمال کرتے ہوئے مجھے تامل ہوتا ہے۔ بہ ہر کیف صحابہ کرام کے زمانے سے اس پر غور وخوض شروع ہوا۔ جب مجتہدین کا زمانہ آیا تو ان موضوعات پر زیادہ گہرائی کے ساتھ تفصیل سے غور وخوض ہوا۔ جن فقہا کے اقوال فقہ کی کتابوں میں اور علماء کی تحریروں میں ملتے ہیں ان میں حضرت ابراہیم نخعی بھی شامل ہیں، جو حضرت عبداللہ ابن مسعود کے شاگردوں

کے شاگرد ہیں، حضرت علقمہ کے شاگرد ہیں۔ اس کے بعد تقریباً تمام فقہائے اسلام نے جزوی یا کلی طور پر ان میں سے کسی ایک یا دوسرے مقصد کا ذکر کیا، لیکن ان میں سے جس فقیہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ان پانچ کلیات کو ان الفاظ، اور اس ترتیب سے بیان کیا وہ امام الحرمین ہیں۔

امام الحرمین عبدالملک ابوالمعالی الجوینی امام غزالی کے استاد تھے اور امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہیں، کچھ عرصے مکہ مکرمہ میں، کچھ عرصے مدینہ منورہ میں، حرمین میں امامت کرتے رہے، اس لئے امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ فقہ شافعی کے مجددین میں ان کا شمار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فقہ شافعی کے مدونین ثانوی دور میں ایک امام رفع الکبیر ہیں اور ایک امام الحرمین ہیں۔ ان کی ایک کتاب ابھی حال ہی میں چھپی ہے نہایت المطلب، کافی بڑی کتاب ہے، پچیس تیس جلدیں ہیں۔ پوری انسائیکلو پیڈیا ہے کہ اس سے بڑھ کر فقہ شافعی میں کوئی اور کتاب ان سے پہلے بھی نہیں ملتی، بعد میں بھی نہیں ملتی۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنی کتاب البرہان فی اصول الفقہ میں جو اصول فقہ کی چار بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے، یہ پانچ اصول اس ترتیب سے بیان کئے، جس ترتیب سے میں نے ابھی بیان کئے۔ امام الحرمین کے شاگرد امام غزالی نے المستصفٰی میں بہت زیادہ تفصیل اور دلائل کے ساتھ ان کو ثابت کیا۔ اور ایک اعتبار سے اس تصور کے امام غزالی مرتب حقیقی ہیں۔ امام الحرمین موجد اور امام غزالی مدون اور مرتب۔ اس کے بعد کوئی ایسا فقیہ نہیں ہے جو امام غزالی کے بعد آیا ہو اور جس نے ان مقاصد پر کلام نہ کیا ہو۔ مقاصد پر کلام کرنے والے تو بے شمار ہیں، ابن تیمیہ ہیں جن کی پوری کتابوں کے دفتر کے دفتر میں یہ چیزیں بکھری ہوئی ہیں، ان کے فتاویٰ ۳۵ جلدوں میں آپ نے دیکھے ہوں گے۔ ان میں یہ سارے مباحث بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے شاگرد رشید ابن قیم کی کتابیں اس سے بھری ہوئی ہیں۔ ان مباحث یا جزوی مباحث سے سب نے اعتنا کیا ہے۔ لیکن جن فقہا نے سب سے زیادہ اس پر مرتب انداز سے کام کیا، جس کو میں انگریزی میں کبھی کہتا ہوں کہ یہ بائبل آف دی مقاصد ہیں۔ یعنی فقہ مقاصد کی بائبل۔ انگریزی میں اگر اعلیٰ ترین فن کی کوئی کتاب ہو تو اس کے لئے مجازاً بائبل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مقاصد شریعہ کے حوالے سے اس نوعیت کی تین کتابیں ہیں۔

سب سے پہلی کتاب سلطان العلماء نے لکھی، وہ بھی اتفاق سے شافعی تھے۔عز الدین عبدالسلام السلمی، سلطان العلماء ان کا لقب ہے اور یہ واقعی اپنے زمانے کے سلطان العلماء تھے۔مملوکی دور میں مصر کے قاضی القضاۃ تھے اور یہ انسانی تاریخ میں واحد مثال ہیں جنہوں نے بادشاہ وقت کو نیلام کیا۔ایسی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔آپ اس قاضی القضاۃ کی جرأت اور آزادی کی قوت کا اندازہ کریں کہ جو بادشاہ وقت کو بازار میں نیلام کردے۔بیع من یزید کے ذریعے۔کیسے؟ آپ کو معلوم ہے خاندان غلاماں کی حکومت ہندوستان میں بھی تھی اور مما لک کی حکومت مصر میں بھی تھی، ایک زمانے میں بادشاہوں نے خاص طور پر ان بادشاہوں نے جن کے ہاں اولاد نرینہ نہیں ہوتی تھی یہ طریقہ اپنایا کہ غلام خریدتے تھے، اس کو تعلیم دیا کرتے تھے، تربیت دیا کرتے تھے۔مسلمانوں میں غلاموں کی تربیت کی روایت شروع سے رہی ہے، احادیث میں اس کی فضیلت آئی ہے، احادیث میں غلام کو تربیت کر کے آزاد کرنے والوں کو دوہرے اجر کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔مسلمانوں میں یہ رواج صحابہ کرام سے ثابت تھا۔صحابہ کرام نے سیکڑوں غلام تربیت کر کے آزاد کئے۔تابعین نے کئے، بادشاہوں میں بھی یہ رواج تھا۔ ہندوستان میں بھی تھا اور مصر میں تھا اور جگہوں میں بھی تھا، بادشاہ غلام خریدا کرتے تھے، تربیت دیا کرتے تھے، بیٹا بنالیا کرتے تھے، فوجی اور دوسری مہمات میں کام لیا کرتے تھے۔اور بعد میں جانشین بھی ہوجایا کرتے تھے، بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ بادشاہ نے غلام کو فارملی یا ٹیکنیکلی آزاد نہیں کیا اور ویسے وہ نظری طور پر غلام ہی رہا، لیکن عملاً اس کا بیٹا یا داماد رہا، فوجوں کے کمانڈر بھی رہا، صوبوں کا گورنر بھی رہا، تو سلطان العلماء کے زمانے میں بھی ایسا ہی تھا، اتفاق سے جو بادشاہ بنا اس کو اس کے سابق آقا نے آزاد نہیں کیا تھا لیکن وہ بادشاہ بن گیا، کوئی فیصلہ سلطان العلماء کی عدالت میں آیا، انہوں نے اس کو آج کل کے قانون کی اصطلاح میں اسٹرائیک ڈاؤن کردیا۔یعنی بادشاہ کے اس فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا اور اصطلاح میں کہا کہ یہ حدود اختیار آئین سے متجاوز ہے۔تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے بادشاہ وقت کے حکم کو الٹرا وائرس آف دی شریعہ قرار دیا، کہ یہ فیصلہ حدود اختیار شرعیہ سے متجاوز ہے، بادشاہ کو شریعت نے یہ اختیار نہیں دیا، اس لئے یہ فیصلہ کالعدم ہے۔ظاہر ہے بادشاہ تو ناخوش ہوا ہوگا، اس سے راضی تو نہ ہوا ہوگا، اس نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور سلطان العلما کے فیصلے

کونظرانداز کرتے ہوئے اپنے حکم پر عمل درآمد کرادیا۔ جب سلطان العلما کو یہ معلوم ہوا تو وہ اتنا قوی آدمی تھا کہ اس کے گھر میں کوئی ساز وسامان بھی نہیں تھا، اس نے ایک گھڑی میں اپنا ساز وسامان رکھا، اپنے خچر لئے۔ ایک خچر پہ خود سوار ہوئے ایک پہ بیوی کو بٹھایا اور ایک تیسرے خچر پہ اپنی گٹھڑی رکھی اور کہنے لگے کہ میں مصر سے جا رہا ہوں، اور نکل کر روانہ ہوگئے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ پورا قاہرہ شہر گلیوں میں آ گیا کہ ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے، انہوں نے کہا جس شہر کا حکم راں شریعت کے حکم کو نہیں مانتا، میں اس شہر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔ مصر میں بغاوت کا خطرہ ہوگیا۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی وہ دوڑا ہوا آیا کہ میں معافی چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا تم نے یہ کیوں کیا؟ وہیں سڑک پر جہاں وہ جا رہے تھے دربار لگا، اس نے کہا جی آپ نے میرے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا، انہوں نے کہا اس لئے کہ تم غلام ہو، غلام کا فیصلہ آقا کی اجازت کے بغیر کالعدم ہے، جائز نہیں۔ ہر فقہ کی کتاب میں لکھا ہوا کہ فضولی اور غلام کا فیصلہ آقا یا مالک کی اجازت پر موقوف ہے۔ انہوں نے کہا پھر اصلی آقا کون ہے؟ انہوں نے کہا عوام ہیں، عامۃ الناس ہیں، تم بیت المال کے غلام تھے، بادشاہ کے ذاتی غلام نہیں تھے۔ لہٰذا یا تو اصل مالکان تمہیں آزاد کر دیں اور تم بادشاہ بنو، تمہارا حکم واجب التعمیل ہوگا۔ اس نے کہا اس کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ انہوں نے کہا چوں کہ بادشاہ موجود نہیں ہے وہ مرگیا ہے اور فقہا نے لکھا ہے کہ بیت المال کا متولی اگر امام وقت نہ ہو تو قاضی القضاۃ ہوگا۔ لہٰذا میں بیت المال کا متولی ہوں۔ میں اس کے لئے تیار ہوں کہ میں تمہیں بیچ دوں اور کوئی خرید کر آزاد کر دے۔ پھر تمہیں بادشاہ بنالیں، پھر تمہارا حکم واجب التعمیل ہوگا۔ چناں چہ انہوں نے وہاں کھڑے کھڑے اعلان کیا کہ کل یا فلاں تاریخ کو، فلاں وقت بادشاہ نیلام کیا جائے گا۔ چناں چہ پہلے اس کو بادشاہت سے نکال کر بیت المال میں بھیج دیا گیا، اگلے دن لوگ جمع ہوئے، سلطان علماء نے بیع من یزید کے تحت بولی لگائی۔ کون زیادہ دیتا ہے من یزید، من یزید، من یزید، بالآخر آخری بولی پر فیصلہ ہوا، بیع ہوئی، خریدنے والے نے خرید کر بادشاہ کو آزاد کر دیا۔ پھر سلطان العلماء نے کہا کہ اب میں آپ کے فیصلے پر عمل درآمد کراؤں گا۔ ان سلطان العلماء کی، یہ واحد مثال ہے، یہ ضمنی مگر ضروری بات تھی، اس لئے میں نے بیان کر دی۔ سب سے پہلے کتاب ان کی ہے ''قواعد الاحکام فی مصالح الانام'' دینی علوم کے طلبہ کو میرا مشورہ ہوگا کہ اس کتاب کو ضرور

پڑھیں۔ چھوٹی سی کتاب ہے زیادہ بڑی نہیں ہے۔اس میں انہوں نے پہلی مرتبہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ شریعت کے احکام جتنے بھی ہیں وہ سب کے سب ان امور سے متعلق، مصلحت کے حصول اور مفسدہ کے اندفاع کے لئے ہیں۔ جتنے مفاسد ہیں ان کو ختم کیا جائے۔ جتنے مصالح ہیں ان کو حاصل کیا جائے۔ پھر مصلحت کیا ہے؟ مفسدہ کیا ہے؟ اس پر انہوں نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے، اور بڑے منطقی اور عقلی اور شرعی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ مصلحت کو مصلحت کیوں کہتے ہیں؟ اور مفسدے کو مفسدہ کیوں کہتے ہیں؟ پھر انہوں نے بحث اٹھائی کہ بعض اوقات ایک مصلحت کا حصول کسی وسیلے کے استعمال پر موقوف ہوتا ہے، جب تک وہ وسیلہ آپ اختیار نہ کریں مصلحت کو حاصل نہیں کر سکتے، اسی طرح سے کسی مفسدے کا حصول کسی وسیلے پر مبنی ہوتا ہے، اس کے لئے انہوں نے جو کلیہ نکالا اسے آج دنیا میں تمام قوانین مانتے ہیں۔ اتنے خوب صورت اور جامع الفاظ میں تو نہیں مانتے، لیکن یہ تصور دنیا کے قوانین کو انہوں نے دیا۔ انہوں نے کہا:

الوسيلة الى افضل المقاصد افضل الوسائل، والوسيلة الى ارذل المقاصد ارذل الوسائل

جیسا مقصد ہوگا وہی حکم وسیلے کا ہوگا۔ مقصد افضل ترین ہے تو وسیلہ بھی افضل ترین ہوگا۔ مقصد ارزل ترین ہے تو وسیلہ بھی ارذل ترین ہوگا۔

یہ کتاب سب سے پہلی مرتبہ لکھی گئی اور علمی اعتبار سے دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تھی، اور بڑی حد تک آج بھی نہیں ہے، جس میں انسانوں کی مصلحت اور مفاد کو، انسانوں کے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے مفاد کو قانون کی بنیاد پر اتنی جامعت اتنے عقلی استدلال اور اتنی مضبوط اور محکم بنیادوں میں بیان کیا گیا ہو۔

عز الدین عبدالسلام کے بعد ان کے تلامذہ کا زمانہ ہے، ان کے تلامذہ میں شافعی مالکی سب شامل ہیں، لیکن جن کا کام سب سے زیادہ نمایاں ہے اور بہت غیر معمولی ہے وہ امام قرافی ہیں جو مالکی ہیں اور غالباً مالکی فقہا میں ان سے بڑا فقیہ اس خاص نقطہ نظر سے آج تک پیدا نہیں ہوا، ایک موضوع کم از کم ایسا ہے جس پہ انہوں نے جو کام کیا ہے آج تک کوئی اس سے بہتر کیا اس کے برابر کیا اس کے ایک تہائی بھی نہیں کر سکا، وہ ہے کتاب الفروق۔ یعنی شریعت

کے مختلف احکام میں بہ ظاہر جو فرق معلوم ہوتا ہے وہ حقیقی طور پر کتنا ہے؟ اور ظاہری طور پر کتنا ہے، اس پر انہوں نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، اور پانچ سو ساٹھ فروق بیان کئے ہیں، اور ایک ایسے علم کی بنیاد ڈالی ہے جس کی مثال ابھی تک دنیا کے قانونی نظاموں میں نہیں ہے۔ دنیائے مغرب کے پاس آج بھی کوئی ایسا فن یا علم موجود نہیں ہے جس کو کتاب الفروق کا یا علم الفروق کا مماثل یا مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں اور اپنی دوسری کتابوں میں امام قرافی نے ان پانچوں مقاصد کے ذیلی مباحث کو بہت محکم کیا۔ یہ تو بنیادیں ہوگئیں۔ اب ان بنیادوں کو مزید نکھارنے میں ان کا حصہ ہے۔

لیکن سب سے زیادہ جو نمایاں ترین کام ہے اور فقہ مقاصد کی اصطلاح جو آج کل بہت استعمال ہو رہی ہے۔ اصل جو عمارت ہے، اس کا قلعہ معلیٰ جس نے بنایا ہے اور جو پوری امت مسلمہ کے تشکر اور تحسین کا مستحق ہے اور پوری امت مسلمہ کا سر امتنان اس کے سامنے خم ہونا چاہئے وہ امام ابو اسحاق شاطبی ہیں، وہ بھی مالکی ہیں ان کی کتاب ہے ''الموافقۃ فی اصول الشریعۃ'' چار جلدوں میں ہے اور بارہا چھپی ہے، میرا ذاتی خیال ہے کہ دنیا کے قانونی ادب میں مشرق اور مغرب کے قانون لٹریچر میں کوئی کتاب اس درجے کی نہیں ہے، جس میں اس انداز سے کسی قانون کی حکمت، مصلحت اور فلسفے کو بیان کیا گیا ہو، جس انداز سے امام شاطبی نے بیان کیا ہے۔ امام شاطبی کے زمانے تک جتنے علوم وفنون تھے، منطق، فلسفہ، لغت، زبان، تاریخ اور بلاغت، اور نفسیات اور طب ان سب سے کام لے کر انہوں نے شریعت کی حکمت کو بیان کیا۔ اس کتاب سے میرے ذہن میں یہ تصور پہلی مرتبہ واضح ہوا کہ مسلمانوں کے علوم وفنون کی جو جہت ہے یا رخ ہے جیسے انگریزی میں کہتے ہیں، Thirso یہ ہونی چاہئے کہ وہ شریعت کی حکمت اور قرآن پاک کے پیغام کو بیان کرنے والے اور تشریح کرنے والے ہوں۔ ان کی تاریخ بھی، ان کی طب بھی، ان کی سائنس بھی، ان کا فلسفہ بھی، ان کے علوم وفنون بھی ان سب کا محور اعظم قرآن پاک کو ہونا چاہئے۔ اگر قرآن پاک تمام علوم وفنون کا محور اعظم ہے اور محور حقیقی ہے تو پھر سارے علوم وفنون اسلامی ہیں، ان کا تعلق چاہے اس دنیا سے ہو چاہے اس دنیا سے ہو۔ اور اگر ان علوم وفنون کا محور قرآن پاک نہیں ہے تو پھر وہ اسلامی فن یا اسلامی علم نہیں ہے، اور اگر اس کی محوریت میں کوئی کمی ہے تو اسی حد تک ان کی اسلامیت میں کمی ہے، جس حد

تک محوریت میں کمی ہے۔

اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی ادوار میں کم از کم ایک ہزار برس تک اسلامی علوم فنون کا محور قرآن پاک کس انداز سے تھا؟ اس بات کو یہ انہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس کا تھوڑا سا خلاصہ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

امام شاطبی نے بنیادی طور پر یہ بات لکھی ہے کہ مصلحت کیا ہے، یہ بات اس سے پہلے بھی بیان کی گئی ہے، لیکن انہوں نے جس تفصیل سے لکھی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے، مختصر انداز میں دوسرے فقہا بھی لکھتے چلے آئے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں مصلحت ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں ہر فرد اپنا ایک تصور رکھتا ہے۔ ایک تاجر کی مصلحت یہ ہے کہ اس کی بکری زیادہ ہو۔ دوسروں کی دکانیں بند ہو جائیں اس کی دوکان چلے۔ اس طرح کی مصلحت کا تعین اگر ہر فرد کی صواب دید پر کیا جائے تو دنیا کا سارا نظام تباہ ہو جائے گا۔ اس لئے مصلحت کے حقیقی اور غیر حقیقی ہونے کا تعین کسی ایسی بنیاد پر ہونا چاہئے جو سب کے لئے یک ساں ہو۔ وہ بنیاد صرف شریعت الٰہی ہو سکتی ہے۔ شریعت الٰہی چوں کہ سب کی مصالحت سے ماورا ہے، اور تمام مصلحتوں سے بالاتر ہے، اس لئے وہ ایک تواتر کے ساتھ اور غیر جانب داری سے تعین کر سکتی ہے کہ کون سی مصلحت قابل قبول ہے، اور کون سی قابل قبول نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مصلحت کی تین قسمیں ہیں:

ایک مصلحت معتبرہ ہے۔ وہ مصلحت جس کو شریعت نے معتبر قرار دیا ہے، قرآنِ پاک نے معتبر قرار دیا ہے، سنت نے معتبر قرار دیا ہے، یا کسی معتمد استنباط سے کسی مستند فقیہ نے اسے معتبر قرار دیا ہو، جس کی بنیاد قرآنِ پاک سے استنباط یا استدلال سے قائم ہوتی ہو، یا سنت پر قائم ہوتی ہو۔ وہ تو مصلحت معتبرہ ہے۔ اور مصلحت معتبرہ میں سے ہر ایک کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ ان پانچ مقاصد سے ہوگا۔ اگر کوئی مصلحت ایسی ہے جس سے انسانوں کے جان و مال کا تحفظ ہوتا ہے تو مصلحت معتبرہ ہے۔ مثلاً ٹریفک کے قوانین مصلحت معتبرہ کے تحت آتے ہیں کہ انسانوں کے جان و مال کا تحفظ کرتے ہیں۔ لوگوں کی گاڑیاں محفوظ رہتی ہیں، جان محفوظ رہتی ہے۔ لوگ زخمی نہیں ہوتے۔ تو یہ مصلحتِ معتبرہ ہے، اس لئے قابل قبول ہوگی۔ شریعت اس کو مصلحت کے تحت قبول کرے گی۔ مصلحت سے اردو والی مصلحت نہ سمجھئے گا۔ اور انگریزی والی

بھی نہ سمجھئے گا، یہاں مصلحت سے Expedieincy مراد نہیں، یہاں Expediency اور مصلحت جو اردو استعمال ہے وہ ایکس پی ڈینسی کا ترجمہ ہے، وہ یہاں مراد نہیں ہے۔ مصلحہ دراصل مصدر میمی ہے، مصدر میمی سے عربی والے واقف ہیں، صلاح کا مصدر ہے، صلاح کے معنیٰ ہیں اصل کامیابی۔ حقیقی کامیابی کو عربی میں صلاح کہتے ہیں، یعنی دائمی مصلحت، مصدر میمی میں تمام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ بھی عربی کے طلبہ جانتے ہیں۔ یعنی حقیقی اور دوامی اور دائمی مصلحت اور مفاد انسانوں کا اور صلاح و بہبود جس چیز میں ہو وہ عربی زبان میں مصلحت کہلاتی ہیں۔ تو اس کو اردو کی مصلحت سے یا Expediency سے مخلوط نہ کیجئے گا۔ یہ مصلحتِ معتبرہ ہے۔

دوسری مصلحت وہ کہلاتی ہے جو مصلحتِ ملغیٰ ہے، یعنی جس کو شریعت نے لغو قرار دیا ہے، اور اس مصلحت کا اعتبار نہیں کیا۔ شریعت نے صراحت کے ساتھ اس مصلحت کو غیر معتبر قرار دیا۔ مثال کے طور پر گرمی کے مہینے میں روزہ کھولنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ سخت گرمی میں بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا، جزیرۂ عرب کے باشندوں کو بھی دیا، جہاں بہت گرمی ہوتی ہے اور تمام علاقے کے لوگوں کو بھی یہی حکم دیا۔ انتہائی سخت گرمی میں بھی ظہر کی نماز کے لئے جانے کا حکم دیا کہ ظہر کی نماز جماعت سے پڑھنی پڑے گی۔ یہاں گرمی لگنے نہ لگنے کو شریعت نے معتبر مصلحت نہیں سمجھا۔ لہٰذا یہ مصلحت معتبر نہیں ہے۔ یہ مصلحت ملغیٰ یا غیر معتبرہ ہے۔

تیسری مصلحت وہ ہے جس کو امام مالک مصلحت مرسلہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ مصالح جس کو شریعت نے چھوڑ دیا ہے، یا مصلحتِ مسکوت عنھا۔ جس کے بارے میں شریعت ساکت ہے۔ اس کے بارے میں فقیہ کا یہ کام ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اگر اس سے شریعت کا کوئی حکم پورا ہوتا ہے یا مصلحت معتبرہ اس سے آگے بڑھتی ہے۔ مصلحت معتبرہ کی خدمت اس سے ہوتی ہے، اور شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی، اگر یہ صورت ہے تو وہ مصلحت قابل قبول ہے۔ اس مصلحت کی بنیاد پر احکام مرتب کئے جاسکتے ہیں۔

یہ تفصیل بہت حکمت اور دانائی کے ساتھ امام شاطبیؒ نے بیان کی ہے۔ امام شاطبیؒ نے ایک بڑی بنیادی بات اور کہی ہے یہ بات امام شاطبی نے سب سے پہلے اپنی کتاب میں

کہی ہے، میں نے پہلے کسی کتاب میں یہ بات نہیں پڑھی اس لئے میں عرض کر رہا ہوں۔انہوں نے ایک بحث یہ اٹھائی ہے کہ جس کا عنوان ہے ''لا عبث فی الشریعۃ'' شریعت میں کوئی حکم عبث اور بے فائدہ نہیں۔انہوں نے قرآنِ پاک کی آیات سے استدلال کیا ہے۔قرآن پاک کی آیات میں آیا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ O (۲۰)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو کھیلنے کے لئے نہیں بنایا۔

اور اس طرح کی درجنوں آیات ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر حکم کی ایک علت اور ایک حکمت ہے۔لہٰذا شریعت کے کسی حکم کی کوئی ایسی تعبیر یا کوئی ایسی تفسیر، کوئی ایسا فتویٰ، کوئی ایسا اجتہاد قابل قبول نہیں ہے جس کے نتیجے میں کوئی حکم شریعت عبث قرار پاتا ہو۔ہر حکم شریعت پر عمل درآمد ہونا چاہئے اور کوئی حکم شرعی ایسا نہ ہو جو مہمل قرار پائے غیر معمولی قرار پائے۔یہ خلاصہ ہے ان کی بحث کا، دوسری بات جو دوسرے فقہا نے بھی لکھی ہے لیکن جتنی تفصیل سے امام شاطبیؒ نے لکھی ہے اتنی تفصیل سے کسی اور نے نہیں لکھی۔اور آج اس کو نئے انداز میں نئے محاورے میں بیان کرنے کی ضرورت ہے۔امام شاطبی نے یہ لکھا ہے:

ان هذه الشريعة عربية امية، يجب ان يُفهمَ على هذاالاساس

یہ لفظ ذرا نازک ہے، غلط فہمی کا امکان نہ رہے، آپ میری بات ذرا غور سے سنئے گا کہ یہ شریعت عربی شریعت ہے، اور امیین میں نازل کی گئی تھی اور اس کی تعبیر اور تشریح میں ان دونوں اساسات (بنیادوں) کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

جہاں تک عربیت کا تعلق ہے یہ بات واضح ہے کہ قرآن پاک عربی مبین میں نازل کیا گیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک میں نازل کیا گیا۔قریش کے محاورے کے مطابق نازل کیا گیا۔لہٰذا قرآن پاک کے کسی بھی لفظ کی کوئی ایسی تعبیر یا کسی آیت کی کوئی ایسی تفسیر یا کسی حکم کی کوئی ایسی تشریح قابل قبول نہیں ہے جو قریش کے محاورے کے خلاف ہو، اور اس زمانے کی زبان کے خلاف ہو، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں بولی

۲۰۔ الانبیاء:۱٦

جاتی تھی۔ اس لئے بعد کے مجتہدین کی کوئی بات قابل قبول نہیں ہے، اگر اس زمانے کی عربی زبان کے محاورے اور اصول کے خلاف ہو۔ اس لئے اس زمانے کے علماء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زبان کے محاورے کو جمع کرنے میں جتنی کوششیں کی ہیں، اتنی کوششیں کسی زبان کے لئے نہیں ہوئیں۔

عبدالملک اصمعی ایک بزرگ تھے، جو عربی زبان کے بڑے ادیب تھے اور اپنے زمانے کے عباسی خلیفہ منصور نے یا کسی اور نے انہیں، رومیوں کے دربار میں سفیر بنا کے بھیجا، تو رومی بادشاہ اصمعی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے کہا مجھے حیرت ہے کہ اتنا ذہین آدمی بھی عرب میں ہوتا ہے۔ اس نے بعد میں ایک خط لکھا، اور یہ کہا کہ یہ اپنے خلیفہ کو دے دینا اور اس خط میں یہ لکھا کہ مجھے بڑی حیرت ہے کہ اتنا ذہین آدمی آپ کے ہاں ہے، اور یہ خلیفہ کیوں نہیں ہے؟ یہ خط اس نے بند کر کے مہر لگا کے دیا کہ خلیفہ کو دے دینا۔ خیر واپس آئے انہوں نے خط خلیفہ کو دیا اس نے کھولا، پڑھ کے دیکھا پھر اصمعی سے کہا کہ تمہارے خیال میں اس نے خط کیوں لکھا ہوگا؟ اصمعی نے کہا کہ میرے خیال میں تو اس لئے لکھا ہے کہ مجھ سے وہ حسد میں مبتلا ہوگیا ہوگا، اور یہ خیال ہوگا کہ آپ کے دل میں بھی میری طرف سے خطرہ ڈال دے اور حسد پیدا کر دے کہ میں خلافت کا دعوے دار بن جاؤں۔ خلیفہ نے کہا کہ میرے ذہن میں بھی یہی آیا ہے۔ اس نے خط کو پھاڑ کے پھینک دیا۔ وہ اس درجے کے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے پچاس سال اس کام میں لگائے، پچاس کہنا تو آسان ہے، چار حرفی لفظ ہے، لیکن پچاس سال لگانا، یہ اصل کام ہے۔ پچاس سال اس کام میں لگائے کہ اونٹ او گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر پورے عرب کی بادیہ اور صحرا کا جائزہ لیا۔ ایک ایک قبیلے میں جاتے تھے اور اس قبیلے کا محاورہ اس قبیلے کی زبان، قرآن پاک کے الفاظ کہاں کہاں استعمال ہوئے ہیں؟ کیسے ہوئے ہیں؟ اس کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے۔ آج عربی زبان اور لغت جو کچھ ہے، اور قرآن پاک کی فہم جس حد تک ہے، وہ بہت حد تک اصمعی کی مرہونِ منت ہے۔ اس کے باوجود ان کی احتیاط کا کیا حال تھا؟ ان کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ کوئی پوچھتا تھا کہ قرآنِ پاک کی فلاں نص کا کیا مفہوم ہے؟ تو کہتے تھے یہ بات تو علماء سے پوچھو، مجھے نہیں معلوم میں قرآنِ پاک کی تفسیر بیان کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ لیکن عربی زبان میں یہ لفظ اس مفہوم میں آتا ہے۔ یہ انہوں نے

التزام کیا۔

زجاج کی تفسیر آپ پڑھی، ابھی چھپی ہے۔ جو لغت کے طلبہ ہیں انہیں میں مشورہ دوں گا کہ تین کتابیں ضرور پڑھیں۔ایک کتاب ہے مجاز القرآن ابوعبیدہ معمر ابن المثنی کی ہے، جو امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں اکثر نقل کر دی ہے۔امام بخاری ترجمۃ الباب میں جہاں الفاظ کے معنیٰ بیان کرتے ہیں، کہیں ابوعبیدہ کے نام سے، کہیں بغیر نام سے، وہ اکثر اس کتاب سے نقل کرتے ہیں۔اس کتاب کے مندرجات تو اکثر لوگوں کے پاس ہیں لیکن الگ کتاب بھی چھپی ہوئی ہے، دو جلدوں میں چھپی ہے۔ دوسری کتاب ہے معانی القرآن للفراء۔فراء بہت بڑے ادیب اور مفسر قرآن تھے اور ہم حنفیوں کے لئے بات خوشی کی ہے کہ وہ امام محمدؒ کے خالہ زاد بھائی تھے۔یحیی الفراء کی کتاب ہے، معانی القرآن۔ تین جلدوں میں ہے اور تیسری زجاج کی کتاب ہے، اعراب القرآن کے نام سے۔علماء نے ابتدائی دو صدیوں میں کس محنت سے قرآن پاک اور عربی کے اسالیب کو جمع کیا ہے، اس کا تینوں کتابوں سے اندازہ ہو جائے گا۔علماء کا جو یہ اہتمام تھا، یہ قرآن کی عربیت کو برقرار رکھنے کے لئے تھا۔ ہر زبان کا محاورہ بدلتا رہتا ہے۔ اگرچہ عربی زبان واحد زبان ہے جس کا محاورہ اب تک اس انداز سے نہیں بدلا، جس طرح بقیہ زبانوں کا بدل جاتا ہے۔عربی زبان آج بھی وہی ہے حوفی الجملہ قرآنِ پاک کی زبان ہے۔صرف ونحو وہی ہے، قواعد زبان کے وہی ہیں، جو قرآن پاک کے الفاظ ہیں وہ عام عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔لیکن مزید یقینی بنانے کے لئے قرآنِ پاک کے محاورے کو ہی علمائے کرام نے محفوظ رکھا۔

دوسری بات ذرا سمجھنے کی ہے، وہ یہ کہ قرآن پاک امیین میں نازل کیا گیا۔ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نازل کرنا چاہتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یونانیوں میں پیدا فرما دیتا، جہاں بڑے بڑے فلسفی اور ماہرین اور بقراط موجود تھے۔بقراط وہیں کا تھا، ہم جو محاورے میں سقراط اور بقراط بولتے ہیں وہ ہیں کے لوگوں کے نام استعمال کرتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روم میں پیدا کر دیتا، جہاں قوانین اور کتابیں اور تصنیفات موجود تھیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امیین میں پیدا کیا۔امام شاطبی نے یہ لکھا ہے کہ امیین میں پیدا کرنے کی مصلحت یہ ہے کہ قرآنِ پاک کی سمجھ کا کم سے کم معیار وہ ہے جو عرب کے امیین نے

سمجھا،۔اور ہر زمانے کے امیین قرآن پاک کو سمجھ سکتے ہیں،لہٰذا قرآن پاک کی کسی آیت کو کوئی ایسا مفہوم قرار دینا، جو اس وقت کے امیین کی فہم سے متعارض ہو، (متعارض کا لفظ بڑا اہم ہے) وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔یعنی اس کی بنیاد پر مزید تفریعات ہوں،مزید اس میں توسیع ہو، مزید(Extention) ہو، یہ تو ہوسکتا ہے،اور ہوتا یہی ہے۔اگر اس زمانے کے لوگوں نے اس کا اتنا مفہوم سمجھا ہو، بعد میں اس میں اضافہ ہوگیا۔اس کی تو گنجائش ہے، جیسے ایک بیج سے گلستاں بن جاتا ہے۔بیج سے تو گلستان بن سکتا ہےلیکن کوئی آدمی اس بیج ہی کا انکار کرے کہ یہ بیج صحیح نہیں تھا،اور جس بیج کو انہوں نے اس کا بیج قرار دیا وہ نیم کا بیج تھا آم کا بیج نہیں تھا، یہ بات درست نہیں ہے، یہ مراد ہے امام شاطبی کی کہ اس گلستاں کو جو قرآن کے معانی اور مطالب سے پیدا ہوا ہے اس بیج سے وابستہ رکھا جائے جو امیین نے بویا اور امیین نے سمجھا اور اپنے زمانے کے محاورے کے اعتبار سے سمجھا۔

اس کے لئے مثالیں امام شاطبی نے بہت سی دی ہیں۔بعض سے اتفاق بھی ہوسکتا ہے،بعض سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔جزئیات میں تو یہ بات رہتی ہےلیکن کلی طور پر یہ بات بڑی اہم ہے،اور یہ بات اس لئے ضروری ہے کہ بعض لوگ آج کل کی چکا چوند سے متاثر ہوکر قرآنِ پاک کے بعض الفاظ کو وہ معانی دینا دین کا تقاضے سمجھتے ہیں اور اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں جو صحابہ کرام اور صدر اسلام کے فہم سے متعارض ہو، اس سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یہ بات چاہے دینی جذبے سے کہی گئی ہو، چاہے اخلاص اور نیک نیتی سے کہی گئی ہو،لیکن یہ اسلام کی بنیاد کو ختم کرنے کے مترادف ہے،اس سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت نہیں ہوگی اور اسلام کا کاز اس سے آگے نہیں بڑھے گا۔

امام شاطبی نے تیسرا کام جو کیا، وہ بہت غیر معمولی ہے جس پر آگے چل کر ذرا تفصیل سے میں گفت گو کروں گا۔وہ یہ کہ انہوں نے ان پانچ مقاصد کے حصول میں سے ہر ایک کی دو دو سطحیں بیان کی ہیں۔ایک یہ کہ مثبت طور پر شریعت ان مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کیا کرتی ہے۔ظاہر ہے شریعت محض مدافع نہیں ہے۔دفاع کرنے والے کا رویہ تو منفی ہوتا ہے۔دفاع کرنے والا تو ایک ردِعمل کا مظاہرہ کرتا ہے! آپ نے حملہ کیا اس نے دفاع کیا۔ اس نے حملہ کیا آپ نے دفاع کیا۔لیکن اصل تو مثبت کام ہے یعنی Positive action اصل

چیز ہے۔تو شریعت ان مقاصد کے حصول کے لئے مثبت طور پر کیا کر رہی ہے۔اور پھر ان مقاصد کے حصول کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں، ان کو شریعت منفی طور پر کیسے دور کرتی ہے۔ اور اگر ایسی منفی قوتوں کے معاشرے میں پیدا ہونے کا امکان ہو، یا ایسی منفی قوتیں پیدا ہو رہی ہوں جو ان مقاصد کی تکمیل کے راستے میں اس وقت یا آئندہ چل کر رکاوٹ بن سکتی ہوں، ان کو روکنے کے لئے شریعت کیا کرتی ہے؟

مثبت طور پر شریعت نے جو اقدام کئے ہیں اور منفی طور پر جو اقدام کئے ہیں ان کی تفصیل تو بہت وقت کی بھی متقاضی ہے، لیکن اس میں دو اصول شریعت کے پیش نظر رہے ہیں۔اور ان دونوں اصولوں کو فقہا نے ''ذریعہ'' کی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ذریعہ وہی ہے جو اردو میں استعمال ہوتا ہے۔

یہاں پہنچنے کا ذریعہ یہ ہے کہ آپ بس میں بیٹھ کر حیدرآباد چلے جائیں۔حیدرآباد پہنچنے کا ذریعہ ٹرین بھی ہے، بس بھی ہے اور موٹر کار بھی ہے۔تو ذریعہ تو وہی ہے جو اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ذریعے کے دو پہلو ہیں، ایک مثبت پہلو ہے ایک منفی پہلو ہے۔ابھی میں نے سلطان العلماء کے حوالے سے کہا تھا کہ وسیلے کا حکم وہی ہوگا جو مقصد کا حکم ہے۔ جو افضل المقاصد ہوں گے اس کا وسیلہ افضل الوسائل ہوگا۔جو ارذل المقاصد ہوں گے ان کا وسیلہ ارذل الوسائل ہوگا۔شریعت نے حکم دیا ہے کہ ہر شخص قرآن کا علم حاصل کرے:

خیر کم من تعلم القرآن وعلمهٗ (۲۱)

تم میں سے بہتر وہ ہے قرآن سیکھے اور سکھائے۔

یہ افضل المقاصد ہے۔ یہ حدیث سے ثابت ہے، اللہ کے کلام کا علم پھیلانا۔اب اللہ کے کلام کے علم کے پھیلانے کے وسائل مختلف ہیں۔ ایک وسیلہ اس ادارے دارالعلم والتحقیق کا قیام ہے۔ایک وسیلہ جامعۃ الرشید کا قیام ہے۔ایک کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات میں شعبہ علوم قرآن کا قیام ہے۔اور مثلاً قرآن ہاؤس ہے، قرآن گھر ہے، قرآن کی نشر واشاعت ہے، مسجد میں حفظ القرآن کا مکتب ہے۔ یہ سارے مختلف وسائل ہیں۔اور ان

۲۱۔ ابوداؤد۔السنن: ج۲،ص۹۶،رقم ۴۵۲

☆ بخاری: کتاب فضائل القرآن،باب خیر کم من تعلم القرآن وعلمه

میں سے اکثر وسائل صدر اسلام میں موجود نہیں تھے۔ایک آدھ کے علاوہ،مکتب وغیرہ تھے، باقی انٹرنیٹ تو اس دور میں نہیں ہوتا تھا۔جامعۃ الرشید تو نہیں تھا، اتنا بڑا ادارہ نہیں تھا، اس طرح کے اور قرآن پاک کے بہت سارے ٹی وی چینل نہیں تھے۔ریڈیو سیٹ قرآن پاک کا نہیں تھا۔ وسائل ہر زمانے میں آتے رہیں گے، اور جب تک وسیلے کو فی نفسہٖ شریعت نے ناجائز قرار نہ دیا ہو، اور وہ کسی مقصد کے حصول کا وسیلہ ہو تو وہ شریعت میں جائز ہے۔اس کو بدعت نہیں کہا جاسکتا۔جو کسی ایسے وسیلے کو بدعت کہتا ہے وہ بدعت کا مفہوم نہیں سمجھتا۔

یہ ہے ''فتح الذریعۃ'' یعنی وہ تمام ذرائع شریعت اختیار کرنے کا حکم دیتی ہے جو فی نفسہٖ ناجائز نہ ہوں۔یہ بات بڑی اہم ہے۔جو ذرائع فی نفسہٖ ناجائز نہ ہوں اور ان سے وہ مقصد پورا ہوتا ہو اور ان سے کوئی منفی نتیجہ نہ نکلتا ہو، اس کی شرائط ہیں، تمام شرائط کے ساتھ اس کا اہتمام کرنا جائز ہے، اور اسے فتح الذریعہ کہا جاتا ہے۔

دوسرا ذریعہ ہے ''سدالذریعۃ'' جو زیادہ اہم ہے، کہ وہ چیزیں جو شریعت میں فی نفسہٖ ناجائز نہ ہوں لیکن اگر اس چیز کو کسی خاص علاقے یا دور یا زمانے میں جاری رکھنے کی اجازت دی جائے تو اس سے ایک منفی نتیجہ پیدا ہوگا۔تو اس زمانے کے اولی الامر یا ارباب حل وقت یا اہلِ افتا یا اہلِ علم اس کو ناجائز قرار دے سکتے ہیں۔یہ زیادہ اہم ہے اور یہ سد ذریعہ ہے۔ فتح الذریعہ کے بارے میں تو زیادہ مباحث نہیں ہیں زیادہ مباحث سد الذریعہ کے بارے میں ہیں۔سد الذریعہ میں مباحث اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ یہ پھر ایک سبجکٹیو چیز ہوجاتی ہے۔ہوسکتا ہے آپ ایک فقیہ ہیں آپ کی نظر میں اس کا وہ نتیجہ نہ نکلتا ہو، اور آپ ایک دوسرے فقیہہ ہیں آپ کے نظر میں نکلتا ہو، تو اب یہاں فتوے کا اختلاف پیدا ہوجائے گا۔جو لوگ آپ کے علم وتقوے پر اعتماد کرتے ہوں گے وہ اس سے اجتناب کریں گے۔جو ان کے علم وتقوے پر اعتماد کرتے ہوں گے وہ اجتناب نہیں کریں گے۔یہ اختلاف کسی چیز کے جواز یا عدم جواز میں پیدا ہوسکتا ہے۔یہ ہوتا رہا ہے لیکن کم ہوا ہے۔زیادہ اتفاق رائے ہی ہوا ہے۔ اختلاف کو لوگ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، اس لئے لگتا ہے بہت اختلاف ہوا۔حال آں کہ ایسا نہیں ہوا۔سد الذریعہ کا حصول بہ راہ راست قرآنِ پاک اور احادیث سے ثابت ہے۔لیکن قرآن پاک کا اسلوب الگ ہے، جیسا میں نے عرض کیا کہ وہ کوئی قانونی کتاب کا

نہیں ہے کہ یہ یہاں قرآن میں آجائے کہ اے مسلمانو! سدالذریعہ کو اپناؤ۔ سدالذریعہ کا لفظ قرآن پاک میں آتا تو اس کا مفہوم کوئی نہ سمجھتا۔ یہ قرآن پاک کا انداز نہیں ہے۔ لیکن قرآن پاک نے ایک ایسے انداز میں اس بات کو کہا کہ جب عام بدو صحابہ نے سمجھا تو انہوں نے اس کا پورا مفہوم سمجھا، اس پر عمل کیا۔ اور جب ائمہ مجتہدین اور امام ابوحنیفہ کی سطح کے انسان نے اس کو سمجھا تو انہوں نے اس کا پورا مفہوم سمجھا۔ مثال کے طور پر قرآن حکیم میں فرمایا:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط (۲۲)

جن لوگوں کو اللہ کے علاوہ پوجا جاتا ہے ان کو برا نہ کہو سب وشتم نہ کرو، اس لئے کہ تم اگر ان کو سب وشتم کرو گے تو وہ اللہ اور رسول کو سب وشتم کریں گے، بغیر علم کے۔

گویا تم اللہ اور رسول کے سب وشتم کا ذریعہ بنو گے۔ آپ کسی کے لات ومنات کو برا کہیں گے وہ فوراً اللہ اور رسول پر آجائے گا۔ تو آپ نے ایسی صورت حال کیوں پیدا کی کہ کوئی اللہ اور رسول کے بارے میں بدزبانی کرے۔ آپ کسی کی محترم شخصیتوں کے بارے میں ایک منفی بات کریں گے وہ آپ کی محترم شخصیتوں کے بارے میں دس باتیں کرے گا۔ یہ ہے سد ذریعہ جو قرآن پاک نے بیان کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ سب وشتم کسی کے دیوتا یا محترم شخصیت کو زیادہ سے زیادہ جائز ہوسکتا ہے۔ مستحب تو نہیں ہے۔ قرآن پاک نے کہیں نہیں کہا کہ لات ومنات کو برا کہو، لیکن بعض اوقات ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز فی نفسہ شرعاً مستحب ہو، مطلوب ہو اور شریعت میں منظور نظر ہو، پسندیدہ ہو لیکن کسی خاص صورت حال میں اس کا نتیجہ منفی نکلنے والا ہو اور وہ منفی نتیجہ اس مندوب یا مستحب صورت حال کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ اور نقصان دہ ہو۔ ایسی صورت میں اس مندوب یا جائز بات سے بھی اجتناب کیا جائے۔ جب مکہ فتح ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا اور یہ بات تمام احادیث کی کتابوں میں مذکور ہے کہ اگر تمہاری قوم نئی نئی اسلام میں داخل نہ ہوئی ہوتی تو میں بیت اللہ کی موجودہ عمارت کو گرا کر اس کو دوبارہ ابراہیم علیہ السلام کے نقش پر استوار کرتا،

۲۲۔ الانعام:۱۰۸

لیکن چوں کہ یہ لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں، اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے، اس لئے میں یہ کام نہیں کرتا۔ گویا ایک ایسا کام جو مندوب ہے، مستحب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں لوگوں کے اسلام سے برگشتہ ہو جانے کا خطرہ ہے، جو بہت بڑی برائی ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو نہیں کیا۔ یہ سد الذریعہ کا اصول ہے۔

علامہ ابن قیم جن کا میں نے ابھی نام لیا، فقہ حنبلی کے دو مجددین کبار میں سے ایک ہیں۔ ان کی ایک کتاب اعلام الموقعین بہت اچھی کتاب ہے، اعلام الموقعین میں انہوں نے ایک جگہ سد الذریعہ سے بحث کی ہے اور اس کی ننانوے مثالیں دی ہیں۔ ننانوے مثالیں دے کر انہوں نے لکھا ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ کے نام ننانوے ہیں، اس لئے تبرکاً یہاں ننانوے مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ یہاں مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں۔ جن حضرات کو یہ مثالیں دیکھنی ہوں وہ اعلام الموقعین میں دیکھ لیں، سد الذریعہ کی ننانوے مثالیں وہاں موجود ہیں۔ اسی طرح امام شاطبی نے اس بحث کو تفصیل سے بیان کیا کہ کسی مصلحت مرسلہ کو جب اختیار کیا جائے اور وہاں سد الذریعہ کو اختیار کرنے کی نوبت آئے، تو اس کے کیا اصول ہمارے سامنے ہونے چاہئیں۔ یہ مختصر سا خلاصہ ہے اس پوری فقہی تفکیر یا غور و فکر کا جو حضرت ابراہیم نخعی سے شروع ہوئی، جن کا ایک قول میں نے ذکر کیا اور سلسلہ امام شاطبی پر آ کے ختم ہوا۔ امام شاطبی کے بعد محسوس ہوتا تھا کہ اتنا بڑا کام انہوں نے کر دیا ہے، اب اس میں کیا مزید اضافہ ہوگا؟ جو بات کہنے کی تھی وہ سب کہی جا چکی۔ لیکن دنیا میں بہت کچھ کہا گیا اس کے بعد بھی کہنے کی گنجائش رہتی ہے۔ ایک معاملے میں ہم برصغیر کے لوگوں کو بڑا شرف حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ مقاصد شریعت کے حوالے سے جس کے لئے انہوں نے اسرار شریعت کی اصطلاح استعمال کی، ایک بہت بڑا اور غیر معمولی کام جو بعض پہلوؤں سے امام شاطبی کے کام سے اونچا ہے، بعض پہلوؤں سے اس کے برابر ہے، وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا کام ہے، جن کو بجا طور پر برصغیر کا امیر المومنین فی الحدیث کہا جانا چاہئے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں انہوں علم اسرار شریعت کو مدون کرنے کی کوشش کی ہے۔ علم اسرار شریعت اور مقاصد شریعت دو متعارض یا منفرد چیزیں نہیں ہیں، بل کہ ان دونوں میں نسبت وہ

ہے جوعموم خصوص من وجہ میں ہوتی ہے ان دونوں کے بہت سے مباحث مشترک ہیں اور بہت سے مباحث الگ الگ ہیں۔

مقاصد الشریعۃ جیسا کہ امام شاطبی کے ہاں یا امام قرافی کے ہاں یا ابن تیمیہ یا ابن قیم کے ہاں یا سلطان العلماء کے ہاں ملتے ہیں، وہ ایک اعتبار سے علم اصول فقہ کی ایک شاخ ہے۔اس میں اصولی مباحث زیادہ ہیں، کہیں کہیں بہ قدر ضرورت کلامی مباحث ہیں۔شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جس انداز سے اس کو مدون کیا ہے، اس کا نقشہ ایک دوسرے انداز سے مرتب فرمایا ہے۔شاہ صاحب نے اسے بنیادی طور پر عقیدے اور کلام کا مسئلہ ٹھہرایا ہے۔عقیدے اور کلام کی بنیاد پر ایک نئی عمارت استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔اور مقاصد شریعت کو یا اسرار شریعت تو اس عمارت کے در و دیوار یا اس باغ کے گل و جوہر یا گل گلستان قرار دیا ہے۔اس لئے امام شاطبی وغیرہ اور شاہ صاحب کے یہاں بہت سارے مباحث مشترک ہیں۔کچھ مباحث شاہ صاحب کے بالکل منفرد ہیں، جو مباحث منفرد ہیں اس میں شاہ صاحب کا درجہ امام شاطبی سے اونچا ہے۔جہاں مباحث مشترک ہیں وہاں ان کے برابر ہے۔جس اعتبار سے شاہ صاحب کا درجہ اونچا ہے وہ یہ بھی ہے کہ امام شاطبی نے جو کام کیا، وہ ایک طرح سے شاہ صاحب کے آدھے کام کے مشابہ ہے۔شاہ صاحبؒ کی کتاب حجۃ اللہ البلاغہ کے دو حصے ہیں، ایک حصہ ہے جس میں انہوں نے کلی مباحث اٹھائے ہیں اور ان اساسات کو بیان کیا ہے یعنی Rational Foundations انہوں نے lay down کی ہیں جس پر وہ اگلا حصہ لکھا چاہتے ہیں، اس میں انہوں نے کائنات کی تخلیق اور خلق و امر کے مباحث یعنی کائنات کی تخلیق سے پہلے سے اپنا بیان شروع کیا ہے۔اور پھر سلسلۂ انبیاء اور نبوت اور روز آخرت اور برّ واثم کی تقسیم کی ہے، اور یہ بحث کی ہے کہ خیر و شر کیا ہے۔گویا اس میں کلام بھی ہے، اور فلسفہ بھی ہے۔اور جسے میٹا جورسٹوڈنس کہتے ہیں وہ بھی ہے۔وہاں سے شروع کر کے ایک فریم ورک بنایا ہے۔اس فریم ورک کی بنیاد پر انہوں نے پھر ایک ایک بات لے کر فقہیات کے جتنے ابواب ہیں، طہارت سے لے کر بین الاقوامی قانون سیر تک اور حدود وقوانین اور معاملات سب کو، ایک ایک کر کے اُس پر منطبق کر کے بتایا ہے۔امام شاطبی کے ہاں کلیات ہیں، بہت مفصل ہیں، موافقات کا حجم شاہ صاحب کی جلد اول سے چھ گنا بڑا ہے، لیکن موافقات کا دائرہ مباحث

اصول تک محدود ہے۔ کلامی مباحث تھوڑے ہیں اور وہ ضمناً ہیں۔ عقائد کی بحثیں برائے نام ہیں۔ تصوف کی بحثیں برائے نام ہیں۔ شاہ صاحب نے تصوف اور عقیدہ اور کلام، فلسفہ، منطق اور تاریخ سب سے کام لے کر وہ اساس مرتب کی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے انہوں نے ایک ایک بات کو بیان کیا ہے۔ ابواب الطہارۃ، ابواب الصلوٰۃ، ابواب الزکوٰۃ اور آخیر تک چل کے ابواب الجہاد والسیر اور ابواب الخلافۃ، سب پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس میں کیا کیا حکمتیں الگ ہیں۔ یہ حصہ شاہ صاحب کے ہاں بہت خاص چیز ہے جو امام شاطبی کے ہاں نہیں ملتا۔ امام شاطبیؒ یہ کام کرنا چاہتے تھے یا نہیں؟ یہ تو معلوم نہیں۔ لیکن کہا یہ جاتا ہے، اور ان کی کتاب سے بھی یہ تاثر ہوتا ہے کہ یہ ایک تمہید تھی، ایک اور کام اس کے بعد کرنا چاہتے تھے جو نہیں کر پائے، ممکن ہے وہ کام اسی انداز کا ہو، جس انداز کا کام شاہ صاحب کرنا چاہتے تھے۔ اور ممکن ہے وہ کام کچھ اور ہو۔

شاطبی کے بعد اور شاہ صاحب کے بعد برصغیر تو اس معاملے میں خالی ہے، دنیائے عرب میں بھی لگتا تھا کہ اس کام پر مزید اضافہ کیا ہوگا؟ لیکن بیسویں صدی میں فقہ مقاصد پر کام کرنے کی ایک نئی روش شروع ہوئی اور یہ تحریک ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ شروع ہوئی۔ تیونس کے ایک عالم تھے، شیخ محمد طاہر ابن عاشور، بڑے فاضل انسان تھے، ان کی تفسیر بھی ہے۔ انہوں نے مقاصد شریعہ پر ایک کتاب لکھی، جو عرب دنیا میں بیسویں صدی میں چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کوشش کی کہ مقاصد شریعت کے تصور کو ایک نئے انداز سے بیسویں صدی کے سیاق وسباق میں بیان کریں۔ تیونس وہ ملک ہے جو سب سے پہلے دنیائے مغرب سے متاثر ہوا۔ دنیائے اسلام میں مغربی اثرات سب سے پہلے تیونس میں آئے، تیونس مغرب سے قریب ترین ملک بھی ہے۔ تھوڑا ہی فاصلہ ہے۔ ترکی اور تیونس دونوں مغرب سے قریب ترین ملک تھے۔ آج بھی تیونس ہی مغرب کے سب سے نمایاں اثرات ہیں۔ تو ان کو بہ ظاہر مغربی افکار سے واقفیت ہوگی، وہ چاہتے تھے کہ اس انداز سے مقاصد شریعہ بیان کریں کہ آج کل کے اہلِ علم طبقات جو مغرب کے تعلیم یافتہ ہیں وہ شریعت کی اس حکمت سے وابستہ ہوں۔ بعض علماء ان کے خیالات سے اتفاق کرتے ہیں، بعض اتفاق نہیں کرتے۔ لیکن ان کے اخلاص میں کوئی شک نہیں کرتا۔ انہوں نے کوشش کی کہ ان پانچ مقاصد

کے علاوہ کچھ اور مقاصد کی نشان دہی کریں۔ جن کا میں نے ذکر کیا کہ یہ وہ ہیں جو متقدمین کے سامنے بھی تھے، عدل اور احسان اور مساوات اور کرامت آدم، یہ عنوانات ان کے سامنے بھی تھے، لیکن ان کو مقاصد قرار دینے کا معاملہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ یہ کہیں کہ عدل شریعت کا بنیادی مقصد ہے، یہ جو یقیناً ہے لیکن انہیں مقاصد شریعہ کی جگہ دے دیں گے، تو یہ مقاصد شریعت ایڈینٹی فائی ایبل ہیں۔ اور ان پر امام نخعی سے لے کر اور خاص طور پر امام الحرمین سے لے کر ہر دور کے فقیہ نے کم از کم ایک ہزار برس تک غور کیا ہے۔ اور ایک ایک چیز جیسے کہتے ہیں کہ Time Tested ہے۔ عدل ایک مبہم سا اور کم زور سا تصور ہے، اس کے بارے میں دنیا کی ہر قوم کا دعویٰ ہے کہ ہم نے عدل قائم کر دیا۔ عدل کے قیام کا تو امریکہ بھی مدعی ہے کہ ہم نے عراق میں عدل قائم کر دیا اور افغانستان میں عدل قائم کر دیا۔ ہندوستان بھی مدعی ہے کہ ہم کشمیر میں عدل قائم کرنا چاہتے ہیں، اس لئے جب ان Time Tested اور متفق علیہ مقاصد کو ثانوی حیثیت قرار دے کر کسی ایسی مبہم چیز کو ثانوی ہدف قرار دیا جائے گا جس کے علم بردار اور دعوے دار اور بھی بہت ہیں تو اس کا مکان ہے کہ ایسے تصورات شریعت میں اور فقہی ادب میں شامل ہو جائیں جو صحیح فقہی فکر کا نمونہ نہ ہوں۔

اس لئے بعض علماء نے شیخ طاہر ابن عاشور کے ان خیالات میں تامل کا اظہار کیا، لیکن ان کی کتاب بہت مقبول ہوئی۔ انہوں نے اخلاص سے لکھی تھی۔ ان کی کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو شرعاً قابل اعتراض ہو، اس کے اثرات بہت ہوئے، اور یہ خیال عرب دنیا میں خاصا پھیلا اور اس کے اثرات ہمارے برصغیر میں بھی آئے کہ مقاصد شریعت میں توسیع کی ضرورت ہے۔ توسیع کی ضرورت اگر فرض کیجئے کہ آج مان لی جائے، تو وہ توسیع کون کرے۔ آپ کریں، میں کروں، شیخ طاہر ابن عاشور کرے، شیخ بن باز کریں، مولانا تقی عثمانی کریں یا ڈاکٹر طاہر القادری کریں یا ٹی وی کے جو دینی پروگرام میں آنے والے مشائخ ہیں وہ کریں یا سب کریں۔ تو ایک ایسا رستہ کھلے گا جس کی منزل کا علم نہیں کہ اس کی منزل کہاں ہے؟ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز پر متقدمین کا اتفاق ہے اور متاخرین تک وہ بہت غور وخوض کے نتیجے میں منتقل ہوئی ہے۔ جس پر سیکڑوں بہترین دماغوں نے غور کیا ہے اس پر اکتفا کیا جائے اور اس سلسلے میں جو اصول قرآنِ پاک میں آئے ہیں، اِن کو اسی حیثیت میں رکھا

جائے جس حیثیت میں متقدمین نے ان کو رکھا تھا کہ یہ حتمی متعین اور کم از کم اہداف ہیں، جن کا حصول مقصود ہے۔ لیکن جب کسی قانون پر غور کیا جائے گا تو وہ دو وسائل سے کیا جائے گا۔ ایک بہ راہِ راست نصوص شریعت پر، اور دوسرے ان مقاصد کے تحت۔

یہاں ایک بات ضمناً میں اور عرض کر دوں کہ اسلامی قانون جس کو کہتے ہیں، فقہ جس کے لئے اصطلاح ہے۔ جس کا عارضی ترجمہ اسلامی قانون ہم کر سکتے ہیں شریعت کی اصل میں تو اصطلاح فقہ ہے۔ فقہ کی جو اصل تعریف ہے اس کو برقرار رکھنا چاہئے، کیوں کہ اس تعریف میں فقہ کی حقیقت کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ اس تعریف سے ہٹ کر جو کام کیا جائے گا اس میں الجھن کا مکان ہے۔ فقہ کی تعریف جو متفق علیہ فقہا کرتے آئے اور ہر فقہ کی کتاب میں لکھی ہوئی ہے:

العلم بالاحكام الشريعة العملية عن ادلتها التفصيلية

شریعت کے عملی احکام کا علم جو تفصیلی ادلۃ سے ماخوذ ہو۔

تفصیلی ادلۃ سے مراد قرآن پاک اور احادیث کی وہ نصوص ہیں جن سے کوئی حکم نکلتا ہے۔ لہٰذا جس حکم کا تعلق بہ راہ راست کسی نص شرعی سے نہ ہو، وہ فقہ کا حکم نہیں ہے۔ وہ اچھی بات ہوسکتی ہے، مگر ضروری نہیں کہ ہر اچھی بات فقہ کا حکم ہو۔ وہ ایک حکمت کی بات ہوسکتی ہے، لیکن وہ فقہ نہیں۔ فقہ وہ ہے جو ادلۃ تفصیلیہ سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا جب ان نئے تصورات کو ماخذ قانون قرار دینے کی غلطی کی گئی، اور نصوص شریعت کو نظر انداز کر دیا گیا تو نتیجہ وہ نکلنے امکان ہے جو مسیحیت میں نکلا۔ مسیحیت نے نصوص قانون کو منسوخ کر دیا، جیسا میں نے عرض کیا، سینٹ پال نے ایسا کر دیا تھا۔ اور بائبل میں یا انجیل میں عہد نامہ جدید میں آئے ہوئے بعض بنیادی اصولوں کو قوانین کی بنیاد بنایا، مثلاً انسانوں سے محبت، جب تک ان چیزوں کو قانون سے آراستہ کر کے اس کی عملی شکل متشکل نہ ہو جائے یہ ایک مبہم اور بے معنی چیز ہے، ایک کم زور چیز ہے۔ لہٰذا نصوص شریعت سے رابطہ تو ایک لمحے کے لئے منقطع نہیں ہوسکتا، اگر منقطع ہوگا تو وہ فقہ کا حکم نہیں رہے گا۔ اور جب منقطع ہوگا اور کسی کم زور یا غیر واضح یا مبہم Principle (قانون) پر دار و مدار کیا جائے گا تو نتیجہ وہی نکلے گا جو دنیائے مسیحیت پر نکلا ہے۔

اس لئے کچھ لوگ ممکن ہے نیک نیتی سے یہ سمجھتے ہوں کہ مقاصد شریعت کی نئ

تعریف اسے کرنی چاہئے، اسے Re-Define کرنا چاہئے اور مقاصد شریعت کو اجتہاد کی بنیاد ہونا چاہئے ۔مگر یہ بات بڑی خطرناک ہے، مقاصد شریعتا جتہاد کے رہ نما تو ہیں لیکن اجتہاد کی بنیاد نہیں ہیں ۔ اجتہاد کی بنیاد قرآن پاک کی نصوص اور احادیث ہیں اور اس کے اصول وہ ہیں جو اصول فقہ میں علمائے کرام نے بیان کئے ہیں ۔ اس میں یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم راستے کی طرف صحیح جارہے ہیں مقاصد شریعت بھی کام دیں گے ۔ اور یہ عدل واحسان اور کرامت آدم کے اصول بھی کام دیں گے ۔ جیسے آپ ریگستان میں سفر کررہے ہوں، رات کو ستارہ نظر آتا ہے، جو یہ رہ نمائی کرتا ہے کہ آپ کو اس طرف جانا ہے، ستارے کی سمت میں آپ چلتے رہیں، لیکن ستارے کو دیکھنے میں آپ یہ نہ خیال رکھیں کہ درمیان میں گڑھا آ گیا تو آپ گڑھے میں گر جائیں گے ۔ ستارہ آپ کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتا ۔ گڑھے میں گرنے سے وہ سڑک بچا سکتی ہے جس پر آپ چل رہے ہیں ۔ اس لئے ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ ستارے پر بھی نظر رکھیں مگر سڑک کو نہ چھوڑیں، اس پر چلتے رہیں تو نصوص شریعت کی حیثیت اُس سڑک کی ہے جس پر آپ کو چلنا ہے، اور مقاصد کی حیثیت اس ستارے کی ہے جس کو دیکھ کر آپ نے اپنا رخ متعین کرنا ہے ۔ تو رخ متعین کرنے پر اکتفا کرنا اور سڑک کا التزام نہ کرنا جتنا خطرناک ہے اتنا ہی خطرناک یہ نیا اسلوب اجتہاد بھی ہے، جس کی علم برداری بعض حضرات نے شروع کی ہے ۔ کتابیں بھی لکھی ہیں ۔ اس موقف کے حامل بعض بڑے قابل احترام حضرات ہیں ۔ ان سے اختلاف کا اظہار کرنا بھی دشوار ہے، لیکن جو بات میں نے دیانت داری سے مناسب سمجھی، وہ آپ کے سامنے عرض کر دی ۔

اب تک یہ گفت گو کی گئی کہ مقاصد شریعہ جس پر فقہائے کرام نے کم وبیش ایک ہزار سال غور وخوض کیا، اس کام کا آغاز کس طرح ہوا؟ کن کن فقہائے اسلام نے اس تصور کو دریافت کرنے میں، اس کو مرتب ومدون کرنے میں، پھر اس کی تفصیلات جمع کرنے میں حصہ لیا اور آج یہ علم جس کو بعض معاصرین نے فقہ المقاصد کے نام سے یاد کیا ہے ۔ ہمارے پاس کس شکل میں ہے؟ آج فقہ المقاصد کے نام سے بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔ بیسویں صدی کے وسط میں فقہ اسلامی کا یہ شعبہ بہت مقبول ہوا ہے ۔ اس شعبے میں درس وتدریس اور تحقیق و تصنیف کا کام کرنے کے لئے بہت سے ادارے بھی قائم ہیں ۔ انگلستان میں ایک ادارہ قائم

ہوا ہے جو ایک سعودی شخصیت نے قائم کیا ہے، جس میں بہت سے اہل علم کام کر رہے ہیں۔ یہ ادارہ اس غرض کے لئے قائم کیا گیا ہے کہ فقہ المقاصد کے بارے میں مسلمان علماء نے جو کچھ لکھا ہے اس کو دور جدید میں سامنے لایا جائے۔ ان کتابوں کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے کئے جائیں اور فقہ المقاصد پر نئے انداز سے تحقیق و تصنیف و تالیف کے کام کو شروع کیا جائے۔ اسی طرح سے دنیائے اسلام کی تقریباً تمام جامعات میں مراکش سے لے کر ملائشیا تک فقہ المقاصد ایک ضروری موضوع کے طور پر شامل ہے اور ان تمام کتابوں کی درس و تدریس جن میں سے بعض کتابوں کا ابتدائی گفت گو میں، میں نے تذکرہ کیا ہے، اب غیر معمولی دل چسپی کے ساتھ شروع ہوگئی۔ لیکن جو بات میں نے ابتدا میں کہی تھی دوبارہ اس کی یاددہانی کر کے آگے بات کرنا چاہتا ہوں۔ فقہ المقاصد کا درجہ یا رتبہ جو متقدمین اسلام نے قرار دیا تھا، اس رتبے سے اس کو نہ زیادہ کرنا چاہئے اور نہ کم کرنا چاہئے۔ فقہ المقاصد کو اگر اپنے رتبے سے بڑھایا جائے اور قرآن وسنت کی نصوص کی جگہ اجتہاد کی بنیاد اس کو بنایا جائے تو یہ نصوص قرآن وسنت سے قطع تعلق کے مترادف ہوگا۔ اور اجتہاد کے عمل کے، جو تسلسل اور تواصل کے ساتھ گزشتہ چودہ سو سال سے یقینی طور پر قائم رہا ہے، معطل ہونے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ اگر فقہ المقاصد کو اپنے رتبے سے گھٹایا جائے تو یہ فقہ اسلامی کے ایک انتہائی اہم اور امتیازی وصف کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا۔ جس انداز سے فقہ مقاصد کے نتیجے میں شریعت کی وائیبلیٹی پر ایک اطمینان قلب حاصل ہوسکتا ہے، اس اطمینان قلبی کے حصول میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اس لئے فقہ اسلامی کا جو درجہ متقدمین نے قرار دیا ہے، اسے اسی درجے تک اس کو رکھنا چاہئے۔

فقہ المقاصد کے مطالعے کے مقاصد کیا ہیں؟ یعنی خود مقاصد کے مقاصد کیا ہیں؟ اس پر بھی غور وخوض کرنا چاہئے۔ بعض اہل علم کا رویہ اس معاملے میں متقدمین کے رویئے سے مختلف رہا ہے۔ جو نہیں ہونا چاہئے۔ کچھ حضرات نے فقہ المقاصد کو سرے سے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ ان میں بڑی حد تک برصغیر کے بہت سے اہل علم بھی شامل ہیں۔ ہمارے ہاں برصغیر میں گزشتہ طویل عرصے تک فقہ المقاصد کے مطالعے کی کوئی سنجیدہ کوششیں نہیں ہوئیں۔

جب سے حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ تصنیف فرمائی تھی، اس وقت سے

حجۃ اللہ البالغہ کے حوالے سے فقہ المقاصد کا مطالعہ شروع ہوا۔لیکن شاہ ولی اللہؒ سے پہلے اس موضوع پر جو کام ہوا، جس میں دو نمایاں ترین کتابیں امام شاطبیؒ اور شیخ عز الدین ابن عبدالسلام کی ہیں۔ان کا مطالعہ ابھی تک اس سطح پر شروع نہیں ہوا، جس سطح پر اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اس مطالعے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ آئندہ آنے والوں زمانوں میں جب شریعت کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں، جب شریعت کے خلاف رائے عامہ استوار کرنے کے لئے لاتعداد وسائل صرف کئے جارہے ہیں، دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کے ارباب حل وعقد شریعت کے خلاف اظہارِ خیال کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے۔ان حالات میں عامۃ الناس کے دلوں میں بالعموم اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں بالخصوص ایمان وایقان کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہے کہ شریعت کے مقاصد واہداف پر نئے انداز سے، نئے اسلوب استدلال کے ساتھ اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں ٹھوس علمی کام کئے جائیں۔

لیکن فقہ المقاصد کی ایک اہمیت اس سے بڑھ کر بھی ہے۔وہ یہ ہے کہ دور جدید ایک ایسا دور ہے جس میں دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔اس ایک دوسرے کے قریب آنے کی وجہ سے بہت سے معاملات میں متفق موقف مسلمان اختیار کررہے ہیں۔گزشتہ چودہ سوسال میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ فقہی معاملات پر فتوے اور اجتہاد کے لئے اجتماعی ادارے قائم ہوئے۔رابطہ عالمِ اسلامی میں ایک فقہ اکیڈمی قائم ہے۔اوآئی سی کے تحت ایک بڑی اسلامی فقہی اکیڈمی قائم ہے۔جس میں تمام مسلم ممالک کے نمائندے سرکاری طور سے شرکت کرتے ہیں۔اسی طرح سے کئی دوسرے ممالک میں بین الاقوامی سطح پر ادارے قائم ہیں اور وہ فقہی اور دینی معاملات میں غور وخوض کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس عمل میں مزید تیزی پیدا ہوگی، اور اس کے موضوعات کی وسعت میں بھی مزید اضافہ ہوگا۔نئے نئے موضوعات اس دائرے میں شامل ہوں گے۔ان حالات میں جو اصول یا قواعد اس پورے عمل کو منظّم کرسکتے ہیں، اس پورے عمل کو منضبط کرسکتے ہیں وہ وہی ہوسکتے ہیں کہ جس پر تمام فقہی مذاہب اور مسالک کا اتفاق ہے۔جب تمام دنیا کے علما اور فقہا مل کر ایک جگہ بیٹھیں گے تو ان کے لئے مشترک کلیات، اور مشترک قواعد کی بنیاد پر کام کرنا ناگزیر ہے۔مثال کے طور پر کسی ایسے

قاعدے یا اصول کی روشنی میں مراکش، انڈونیشیا، ایران، سعودی عرب اور شام کے علماء کا اتفاق رائے کرنا مشکل ہے، اگر چہ ممکن ہے جس کو صرف فقہ حنفی کے فقہا نے مرتب کیا ہے۔ ان حالات میں مشترک قواعد اور مقاصد کا تعین ناگزیر ہے۔ ان مشترک قواعد اور مقاصد میں جو چیز طے شدہ چلی آرہی ہے جس پر بلا اختلاف مسالک سب کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ شیعہ فقہا بھی اتفاق کرتے ہیں۔ وہ دو چیزیں ہیں۔

ایک مقاصد شریعہ کے یہ پانچ مقاصد

اور دوسری قواعد فقہیہ کی بڑی تعداد

قواعد فقہیہ فقہ المقاصد سے ملتا جلتا علم ہے۔ دونوں میں بعض موضوعات مشترک ہیں۔ بہت سے مقاصد وہ ہیں جس کی مزید وضاحت، تشریح وتفسیر کی خاطر فقہا نے قواعد فقہیہ کی شکل دی۔ یہ قواعد فقہیہ بھی تقریباً متفق علیہ ہیں، حتیٰ کہ شیعہ فقہا نے ماضی بعید میں، ماضی قریب میں اور دورِ جدید میں قواعدِ فقہیہ پر کتابیں لکھیں ان میں اور فقہائے حنفیہ کی لکھی ہوئی قواعد فقہیہ کی کتابوں میں، فقہائے شافعیہ کی کتابوں میں، فقہائے مالکیہ کی کتابوں میں کوئی فرق نہیں۔ ان کتب کے ٩ء٩٩ فیصد مباحث متفق علیہ ہیں۔ اس لئے ان دو موضوعات کی اہمیت مستقبل کے فقہی ارتقا اور توسیع کے لئے ناگزیر ہے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ فقہ کے طلبہ مقاصد شریعہ کا مطالعہ کریں۔

لیکن مقاصد شریعہ کا مطالعہ صرف فقہ کے طلبہ کے لئے کافی نہیں ہے، بل کہ وہ تمام حضرات، وہ بڑے علماء، مجتہدین ہوں، وہ مفتیان کرام ہوں، فقہ کے مدرسین واساتذہ ہوں، فقہ کے عام طلبہ ہوں یا وہ عام مسلمان ہوں جو فقہ اور شریعت کے معاملات میں دل چسپی رکھتے ہوں۔

ان سب کو مختلف سطحوں پر مقاصد شریعہ کا علم حاصل ہونا چاہئے۔ اس لئے مقاصد شریعہ کی روشنی میں یہ تعین کرنا آسان ہے کہ کسی مفتی نے کوئی فتویٰ دیا ہے، کسی نئے مجتہد نے کوئی اجتہاد کیا ہے، فرد یا ادارے نے کوئی رائے قائم کی ہے۔ اگر اُس کا رخ ان مقاصدِ شریعت کے مطابق ہے، ان قواعد فقہ سے ہم آہنگ ہے جس پر سب کا اتفاق ہے تو یہ اس بات کی قوی دلیل ہوگی کہ اجتہاد کا رخ درست ہے، اجتہاد کی سمت درست ہے۔

یہ پانچ قواعد یا پانچ مقاصد جن کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا ہے اسی ترتیب کے ساتھ

ہیں۔اور فقہائے کرام نے اس ترتیب کو برقرار رکھنے کی اہمیت پر اصرار کیا ہے۔بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ ترتیب ضروری نہیں ہے، وہ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ کچھ فقہا نے اس ترتیب کے وجوب اور لزوم پر اصرار نہیں کیا۔لیکن وجوب اور لزوم کی صراحت نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ فقہا لزوم اور وجوب کے قائل نہیں ہیں۔بیشتر فقہائے اسلام نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ مقاصد میں یہ ترتیب ناگزیر ہے۔

سب سے پہلے ترتیب میں جو چیز آتی ہے وہ تحفظ دین ہے، دین کے بعد نفس ہے، نفس کے بعد عقل ہے، پھر نسل ہے اور آخر میں مال ہے۔دین کے بارے میں ایک استثنا قرآن پاک نے دیا ہے، اور وہ نص قطعی سے ثابت ہے، لیکن وہ رخصت ہے، عزیمت نہیں ہے:

اِلَّا مَنۡ اُکۡرِہَ وَقَلۡبُہٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِیۡمَانِ O (۲۳)

اس استثنا کے علاوہ بقیہ تمام صورتوں میں اس ترتیب کو برقرار رکھنا لازمی ہے۔سب سے پہلے دین کو رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ پوری شریعت، جس کے یہ مقاصد ہیں، اس شریعت جس کو میں نے پیراڈائم (Paradigm) قرار دیا تھا، جس کے نتیجے میں ایک تہذیب قائم ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں ایک نیا نظام قانون وجود میں آیا ہے، جو دنیا کی تاریخ میں عمیق ترین اور مرتب ترین نظام قانون ہے، جس کے نتیجے میں ایک نیا معاشرہ وجود میں آیا، جو آج بھی اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود بعض اخلاقی اوصاف میں دوسرے تمام معاشروں سے ممتاز ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک ایسا تمدن وجود میں آیا جس کے مظاہر مسلمانوں کے امارات اور طرز تعمیر حتیٰ کہ تصاویر تک میں نمایاں ہیں۔ان سب کی اساس ایک دینی پیغام پر ہے۔اس لئے اگر اولین تحفظ اس دین کا نہ کیا جائے، اولین اہمیت اس دین کو نہ دی جائے تو پھر یہ پورا نظام مختل ہوسکتا ہے۔اگر اس دین کا تحفظ نہ ہو اور انسانی جان و مال کا تحفظ ہو، عزت وآبرو کا تحفظ ہو تو ہو سکتا ہے کہ جان و مال کا تحفظ ہو سکے، ہوسکتا ہے کہ عزت وآبرو کا تحفظ کر لیا جائے، لیکن پھر وہ اسلامی ماحول اور اسلامی تصور کے آئیڈیل کے مطابق تحفظ نہ ہوگا۔اسی طرح کا تحفظ ہوگا جس طرح کا تحفظ دنیا کے دیگر نظاموں میں ہے۔اسلام کی چھاپ اور اسلام کا طرہ امتیاز، اسلام کی

۲۳۔ النحل:۱۰۶

مہر اس پورے نظام میں اس وقت لگے گی جب دین سب سے اولین ترجیح ہو۔ دین کی اولین ترجیح کی بات بار بار کہنے کی ضرورت اس دور میں اس لئے بھی ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا فتنہ جوام الفتن ہے، وہ سیکولرازم اور لادینیت کا تصور ہے۔ سیکولرازم اور لادینیت نے ایک باقاعدہ پیراڈائم کی شکل اختیار کر لی ہے، ایک ایسا پیراڈائم جس کے نتیجے میں ایک لادینی تہذیب پیدا ہو رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر پہلو میں لامذہبیت سرایت کرتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں میں سے بہت سے حضرات بغیر احساس کئے، ان تصورات، نظریات اور خیالات کو قبول کر رہے ہیں۔ جس کے رگ و پے میں لادینیت کے جراثیم اور عناصر موجود ہیں۔ اس لئے شریعت کی یہ بات انتہائی مبنی برحکمت ہے کہ وہاں اولین ترجیح دین کو حاصل ہے۔

دین کی اولین ترجیح ایک اور سبب سے بھی ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی نظام کو قائم کرنے کے لئے ایک تصور کائنات کی ضرورت ہے۔ جس کو مغربی اصطلاح میں WELTEN SCHAUN کہتے ہیں۔ یہ تین الفاظ کا مرکب، ایک جرمن لفظ ہے۔ SCHAUN کا مطلب تصور WELT کا مطلب ورلڈ اور EN کا معنیٰ اور۔ یعنی تصور کائنات یا World View سے مراد یہ ہے کہ جب تک آپ اس پوری کائنات کے بارے میں کوئی تصور قائم نہیں کریں گے، خواہ وہ غلط ہو یا صحیح، اس وقت تک آپ کوئی نظام حیات قائم نہیں کر سکتے۔ چاہے آپ یہ کہیں کہ میں بندر کی اولاد ہوں۔ یہ کہیں کہ میں دیوتاؤں کی اولاد ہوں۔ چندربنسی یا سورج بنسی ہوں، کچھ نہ کچھ آپ کو کہنا پڑے گا۔ وہ صحیح ہو یا غلط۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ کس کام کے لئے آئے ہیں؟ جب تک ان سوالات کے جوابات آپ نہیں دیں گے، آپ کام نہیں کر سکیں گے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ میں آپ سے کہوں کہ آپ یہ ٹکٹ لیں اور پشاور جائیں۔ آپ پوچھیں گے کہ کیوں جاؤں؟ وہاں جا کر کیا کروں؟ جب تک میں ان سوالوں کا جواب نہ دوں، اور آپ کے پاس سوال کا جواب نہ ہو، آپ شاید جانے کے لئے تیار نہ ہوں اور اگر چلے جائیں تو آپ کا یہ سفر بے فائدہ ثابت ہوگا۔ دنیا میں بھی چھوٹے سے چھوٹی ذمے داری اور چھوٹے سے چھوٹے اسائنمنٹ کے لئے ان سوالات کا جواب ناگزیر ہوتا ہے۔

آپ ایک ٹھیکے دار سے کہیں کہ سامنے میدان میں ایک عمارت بنادو۔ وہ پوچھے گا کہ کس مقصد کے لئے بناؤں۔کتنی بڑی بناؤں؟ کیوں بناؤں؟ اس میں آپ کیا کریں گے؟ گویا یہ وہ سوالات ہیں جو ہر کام سے پہلے دنیا میں کئے جاتے ہیں،اس لئے پوری زندگی کا نظام بنانے کے لئے یہ سوالات ناگزیر ہیں۔

کم از کم دین کا ایک پہلو جس کو عقیدے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اسی WELTEN SCHAUN سے عبارت ہے۔جب تک WELTEN SCHAUN یعنی عقیدہ جو دین کی اساس ہے اور عربی زبان میں اور دنیا کی ہر زبان میں قاعدہ ہے کہ تسمیۃ الکل باسم الجز کہ کسی کل کو جز کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جز کو کل کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہر زبان میں اس کا رواج ہے۔تو بعض اوقات دین کی اصطلاح عقیدے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے۔اگرچہ عقیدہ دین کا جز ہے مگر بہت اہم جز ہے۔ بہت بڑا جز ہے،انتہائی بنیادی جز ہے،اس لئے بعض اوقات عقیدے کو بھی دین کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ بنیاد اس لئے ناگزیر ہے کہ اسی پر تمام تعبیرات کا اور افکار کا دارومدار ہے۔اس کے تحفظ کے لئے شریعت نے دو انداز میں پیش رفت کی ہے۔

ایک پیش رفت ہے مثبت انداز میں، دینی اقدار اور دین کی بنیادوں کو مضبوطی سے قائم کرنے کے لئے۔دوسرا پہلو ہے ان بنیادوں کو قائم رکھنے کے لئے اور جو قوتیں ان بنیادوں کے خلاف کارفرما ہوں یا کارفرما ہوسکتی ہیں ان قوتوں کو روکنے کے لئے۔ یہ قوتیں انفرادی بھی ہوسکتی ہیں اجتماعی بھی ہوسکتی ہیں۔

جب ہم دین کے تحفظ کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد کیا ہے؟ یہاں اس سیاق وسباق میں کیا مراد ہے؟ یہاں مقاصدِ شریعہ کے سیاق وسباق میں دین کے تحفظ سے تین چیزیں مراد ہیں۔

سب سے پہلی چیز ہے کہ اسلامی عقائد، جن پر پوری شریعت اور شریعت کے نتیجے میں قائم ہونے والے تمام نظاموں کی بنیاد ہے عقائد ان کے لئے بنیاد اور پلنتھ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کا تحفظ کیا جائے، اس کو انسانوں کے ذہن نشین کرایا جائے، انسان جو اس پر ایمان لائے ہیں امت مسلمہ کے افراد اور ارکان، ان پر ان کا ایمان پختہ ہوجائے اور وہ عقیدہ ان کے رگ وپے میں سما جائے۔ یہ دین کے تحفظ کا سب سے پہلا درجہ ہے۔اس کام کے لئے

ضروری ہے کہ تعلیم وتربیت کا نظام ایسا ہو جس کے نتیجے میں یہ عقیدہ لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے۔اور عقیدے سے مراد وہ ہے جو قطعی الدلالۃ اور قطعی الثبوت قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ یہ بات میں بہت وضاحت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اردو میں عقیدے کا لفظ رائے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا ہے، میرا عقیدہ ہے یعنی رائے ہے، اس لئے یہاں اردو کا عقیدہ مراد نہیں ہے، وہ عقیدہ جو قرآن پاک اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں قطعی الدلالۃ اور قطعی الثبوت دلائل وشواہد سے آیا ہے،جس پر ایمان لانا فرض ہے۔ ماثبث من الدین بالضرورۃ جس کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ وہ عقیدہ عامۃ الناس کے ذہن نشین ہو جائے۔کسی کی رائے عقیدہ نہیں ہے، کسی کا اجتہاد عقیدہ نہیں ہے، کسی کی تعبیر یا رائے میرے یا آپ کے لئے واجب الاحترام ہوسکتی ہے، لیکن وہ عقیدہ نہیں ہے اور اس سے اختلاف کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوگا۔ یہ بات میں اس لئے وضاحت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان مسائل کو سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، سب سے پہلے دین ہے جس میں عقیدہ بنیادی چیز ہے۔

دعوت جب دی جاتی ہے تو دین کی دی جاتی ہے، صحابہ کرام نے دین کی دعوت دی ہے، صحابہ کرام نے شریعت کی دعوت نہیں دی۔ دعوت شریعت کی نہیں ہوتی، دین کی ہوتی ہے۔قرآن پاک نے ہر جگہ دین کی دعوت دینے کو کہا ہے، جو لوگ دین کی دعوت قبول کرلیں پھر وہ شریعت پر عمل درآمد اگلے دن سے شروع کریں گے۔ جب ان کو شریعت پر عمل درآمد کرنے میں کوئی مسئلہ پیش آئے گا تو وہ مفتی کے پاس جائیں گے، مفتی کے فتوے پر عمل کریں گے۔لہٰذا فتویٰ اور دعوت دو الگ الگ چیزیں ہیں، فتوے میں اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن دین میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔ صحابہ کرام میں فتوے کا اختلاف موجود تھا، ان کے درمیان بعض تعبیرات میں اختلاف موجود تھا۔ایک انتہائی جلیل القدر صحابی کی رائے یہ تھی، جس پر کئی صحابہ نے ساتھ دیا:

ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ (۲۴)

۲۴۔ ابوداؤد: ج۳،ص۲۵۲، رقم ۳۱۲۹

☆ بخاری: کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل

میت کواس کے ورثا کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔

حدیث کے طلبہ جانتے ہیں کہ ایک انتہائی محترمہ صحابیہ جن سے نصف دین سیکھنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما، ان کی رائے یہ تھی کہ یہ صحیح نہیں ہے، یہ **الا تزر وازرۃ وزر اخریٰ** (۲۵) کے خلاف ہے، لیکن ان دونوں صحابہ کرام نے جب دین کی دعوت دی تو ان مسائل کی دعوت نہیں دی۔ یہ نہیں کہا کہ اے اہل ایران! اسلام تو قبول کرلو لیکن یہ یادرکھو کہ کہ تمہارا عقیدہ یہ ہونا چاہئے۔ یہ عقیدہ نہیں ہے، یہ رائے ہے۔ جب رائے کو عقیدہ بنایا جائے گا تو اختلاف پیدا ہوگا۔ جب عقیدے کو رائے کا درجہ دیا جائے گا تو عقیدہ کم زور ہوجائے گا۔ عقیدہ عقیدہ ہونا چاہئے۔ رائے رائے ہونی چاہئے۔

رائے کے بعد ایک درجہ ذوق کا بھی ہوتا ہے۔ ہر بڑے انسان کا ایک ذوق ہوتا ہے، صحابہ کرام میں ہر ایک کا الگ الگ ذوق تھا۔ کچھ حضرات کا ذوق بڑا عاقلانہ تھا، کچھ حضرات کا ذوق عاشقانہ تھا۔ عاقلانہ ذوق والوں نے عاشقانہ ذوق والوں کو بے وقوف نہیں کہا۔ عاشقانہ ذوق والوں نے عاقلانہ ذوق والوں کو کم ایمان نہیں کہا۔ ہر ایک اپنے ذوق پر عمل کرتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا مبارک ذوق تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اپنے ذوق کی پیروی کرنے کا حکم نہیں دیا۔ کسی نے محبت سے اس کی پیروی تو کی۔ کچھ کا ذاتی فیصلہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر آپ کی موجودگی میں گوہ کا گوشت لایا گیا، حضور نے پوچھا: کیا ہے؟ میز بان نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گوہ کا گوشت ہے۔ آپ نے وہ قاب دور کردی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے فوراً پوچھا کہ حرام ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حرام نہیں ہے۔

انه لم یکن بارضی قومی فاجدنی اعافه (۲۶)

یہ میرے علاقے میں نہیں ہوتی تھی، اسی لئے میں اس سے دوری محسوس کرتا ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں۔

صحابی کرام کی تربیت اتنی ہوچکی تھی کہ مشہور صحابی اور فاتح اسلام اور ایک بڑے

۲۵۔ النجم: ۳۸

۲۶۔ عجلونی۔ کشف الخفا: ج۲ ص۹۶

جرنیل کے بہ قول، دنیا کی تاریخ کے عظیم ترین جرنیل اور فاتح، خالد بن ولیدؓ نے وہ قاب اپنے سامنے رکھی اور رسول اللہ کی موجودگی میں اسے تناول فرمایا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اظہار ناپسندیدگی نہیں فرمایا۔کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوق کی خلاف ورزی کیوں کر رہے ہو؟ گویا ذوق کی پابندی ذاتی پسند و ناپسند کی بات ہے، آپ کو اپنے شیخ کا ذوق پسند ہے آپ پیروی کریں۔لیکن اگر کسی کو وہ ذوق ناپسند ہے تو آپ کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔اس طرح کی ترتیب عقیدے کے ماننے میں پیش نظر رہنی چاہئے۔یہ بات اس لئے ضروری ہے کہ آج ہمارے دنیائے اسلام میں بہت سے ایسے حضرات ہیں جنہوں نے بغیر کسی تصدیق اور جسٹی فکیشن(JUSTIFICATION) کیامتِ مسلمہ کی تفسیق (کسی کو فاسق قرار دینا) اور تبدیع (کسی کو بدعتی قرار دینا) اور تکفیر (کسی کو کافر قرار دینا) کا شاید پرچم بلند رکھا ہے، اس لئے کہ بعض عقائد کے معاملے میں وہ ان کے اکابر کی تشریح سے اتفاق نہیں کرتے۔اگر قرآن مجید کی کسی آیت کی تفسیر وتشریح میں اکابرِ اسلام مختلف فیہ رہے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، اس میں کسی ایک متعین تفسیر وتشریح کی پابندی لازمی نہیں ہے، آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں اس تفسیر کو غلط سمجھتا ہوں، مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے، لیکن یہ کہنا کہ جو فلاں تفسیر کا قائل نہیں وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، یہ بہت بڑی جسارت ہے۔اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت دے کہ وہ اس تشدد سے بچیں۔

اس عقیدے کو ذہن نشین کرانے کے لئے تعلیم وتربیت کا ایک ایسا نظام ضروری ہے جس میں یہ عقیدہ عامۃ الناس کے مسلمانوں میں ذہن نشین ہو جائے۔اس عقیدے کو ذہن نشین کرانے کے لئے جو نظامِ تعلیم ہونا چاہئے اس کے تین درجے ہیں، اور تاریخ اسلام کے طویل ترین دور میں تقریباً ساڑھے گیارہ بارہ سو سال تک یہ نظام تعلیم مسلمانوں میں موجود رہا ہے۔ آٹھ سو نو سو سال تک بہت کامیابی کے ساتھ، مزید دو سو تین سو تک کسی حد تک انحطاط کے ساتھ یہ نظام مسلمانوں میں رائج رہا ہے۔جس میں عقیدے کی تعلیم اور دین کی تعلیم کی تینوں سطحوں کا پوری طرح سے بندوبست کیا گیا، اور اس کو یقینی بنایا گیا۔

سب سے پہلا درجہ وہ ہے جو عامۃ الناس کے لئے فرض عین ہے، ہر مسلمان کے لئے فرض عین ہے، کوئی مسلمان اس سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔جس کی وجہ سے جس کے

ذریعے سے مسلمانوں کا عقیدہ درست ہو سکے۔ **ماتصح به العقيدة** جس کی وجہ سے،جس کے ذریعے مسلمانوں کا عقیدہ درست ہو سکے۔اور عقیدہ جیسا کہ قرآن پاک کی نصوص قطعیہ میں آیا ہے،سنت کی نصوص قطعیہ،صریحہ ثابتہ میں آیا ہے۔جس کی تعبیر میں اختلاف ہے،اس کی کسی ایک تعبیر کا جاننا یا پابندی مسلمان ہونے کے لئے لازمی نہیں۔جس تعبیر کو آپ صحیح سمجھتے ہوں اختیار کر لیں۔

اس کے بعد دوسرا درجہ آتا ہے **ماتصح به العبادة** جس کی وجہ سے،جس کے نتیجے میں آپ کی عبادات درست ہو جائیں۔اس لئے کہ عقیدے کے بعد پہلا واسطہ مسلمانوں کا عبادات سے پڑتا ہے۔آج اس وقت سوا دس بجے کوئی شخص مسلمان ہوگیا تو سب سے پہلے عقیدہ درست کرے گا۔عقیدے کی درستگی کا اعلان کرے گا اور دو گھنٹے بعد اس کا واسطہ عبادات سے پڑے گا۔ممکن ہے بقیہ معاملات سے اس کا واسطہ ہی نہ پڑے،عصر کے وقت ہارٹ فیل ہوجائے، انتقال کر جائے،ممکن ہے اسے کسی اور فریضے کی ادائیگی کے سلسلے میں معلومات کی ضرورت نہ پڑے۔لیکن اکثر صورتوں میں عبادات سے واسطہ پڑتا ہے اور ضرورت پیش آتی ہے،تو اس لئے ماتصح بہ العبادۃ یہ دوسرا درجہ ہے۔عبادات جو اس پر واجب ہیں، ان کے احکامات زکوٰۃ اگر فرض ہے تو زکوٰۃ کا علم،حج اگر فرض ہے تو حج کا علم۔اگر زکوٰۃ اور حج فرض نہیں تو نماز اور روزے کا علم تو ہر صورت ہی ناگزیر ہے۔اگر وہ اتنا بیمار ہے کہ روزہ نہیں رکھ سکتا تو کم از کم نماز کا علم تو ہر صورت میں ضروری ہے۔

اس کے بعد **ماتصح به المعيشة** کا مرحلہ آتا ہے۔جو شخص جس میدان سے وابستہ ہے،اس کے احکامات کا علم ایک شخص تاجر ہے تو تجارت کے احکام اس کو آنے چاہئیں،تاکہ جائز روزی کما سکے۔ایک شخص زراعت سے وابستہ ہے تو زراعت کے احکام جاننے چاہئیں۔ایک شخص کوئی اور کام کرتا ہے تو اس میدان سے متعلق شریعت کے احکام تھوڑے ہوں یا زیادہ، اسے ان احکامات کا علم ہونا چاہئے۔بعض معاملات میں شریعت کے احکام بہت تھوڑے ہیں۔چند محرمات کی نشان دہی کر دی گئی، باقی سے بحث نہیں کی گئی۔بعض معاملات میں شریعت کے احکام زیادہ ہیں، کوئی شخص قاضی ہے، عدالت کا جج ہے، اسے بہت سارے احکامات آنے چاہئیں۔کوئی شخص فقہ وحدیث کا استاد ہے، مدرس ہے اس کو اور زیادہ علم ہونا چاہئے۔جس کا

جتنا واسطہ ہے، اس واسطے کے حساب سے اس کو اتنا علم ہونا چاہئے تا کہ اس کی زندگی جسے وہ گزار رہا ہے شریعت کے مطابق ہو سکے۔

یہ درجہ تو ہر مسلمان پر فرض ہے۔اس کے بعد قرآن مجید اور شریعت کا یہ مزاج ہے اور قرآن مجید نے اس کا بار ہا اعلان بھی کیا ہے:

لایکلف الله نفساً الا وسعها (۲۷)

اللہ تعالیٰ کسی پر وہ بوجھ نہیں ڈالتا جس کی وہ سکت نہیں رکھتا۔

امتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ نے وہ ذمے داریاں عائد نہیں کیں جو امتِ مسلمہ ادا نہیں کر سکتی۔کبھی نہیں عائد کیں، پہلے دن سے نہیں کیں۔آج بھی نہیں ہیں۔امتِ مسلمہ کے ہر ایک آدمی سے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ تم میں ہر ایک مفتی اعظم ہو جائے، نہ یہ ہو سکتا ہے اور نہ ہوا ہے اور نہ ہر ایک کے پاس اتنا وقت ہے۔صحابہ اکرامؓ میں ہر ایک حضرت علی ابن طالب نہیں تھا: اقضاھم علی ایک ہی تھے۔اعلمھم بالحلال والحرام بھی صحابہ میں ایک ہی تھے یعنی معاذ ابن جبل، باقی سب صحابہ نہیں تھے۔ان سب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ سب حلال وحرام کے علم میں معاذ ابنِ جبلؓ کے علم کے برابر ہو جائیں۔علم وفضل میں شیخین کے برابر ہو جائیں۔تابعین کے دور میں بھی یہ مطالبہ کبھی نہیں کیا گیا کہ ہر تابعی حسن بصریؒ کی طرح ہو جائے۔تبع تابعین کے دور میں یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ ہر تبع تابعی امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی طرح ہو جائے۔اس سے پتہ چلا کہ کچھ لوگ ضرور ایسے ہونے چاہئیں، سب ایسے نہیں ہو سکتے۔اور قرآن پاک میں اس کی صراحت بھی ہے:

مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ (۲۸)

دین میں تفقہ دین میں گہری بصیرت اور دین سے گہری واقفیت ایک چھوٹی تعداد کے لئے مطلوب ہے، لیکن شریعت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ جو چیز فی نفسہٖ مطلوب ہو لیکن مطلوب منہ متعین نہ ہو کہ وہ کس سے مطلوب ہے لیکن مطلوب ہے، تو اسے فرض کفایہ قرار دیا جاتا ہے اور وہ اس اعتبار سے پوری امت سے مطلوب ہوتا ہے کہ امت اس کا بندوبست

۲۷۔ البقرہ:۲۸۶

۲۸۔ التوبہ:۱۲۲

کرے، امت اس بات کو یقینی بنائے کہ ایسے فقہا اور ایسے اہلِ علم ہر وقت اور ہر عہد میں امت میں موجود ہوں، شریعت کے ماہرین موجود ہوں، جو عامۃ الناس کی رہ نمائی کر سکیں۔ یہ دوسرا درجہ ہے۔ فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ ہر عدویٰ یا ہر غدویٰ، دونوں اصطلاحات استعمال ہوتی تھیں۔ غدوہ کے معنیٰ ہیں صبح کو جا کے شام تک واپس آ جائے۔ عدویٰ، الف مقصوریٰ کے ساتھ وہ جگہ جہاں انسان صبح کے وقت جائے اور شام تک واپس آ جائے، اتنی مسافت کے لئے اور اس مسافت سے پیدل مسافت سے مراد ہے، کیوں کہ ہر ایک کے پاس سواری نہیں ہوتی۔ شریعت یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ ہر شخص اپنی سواری رکھے۔ نہ اس وقت ہر کسی کے پاس گھوڑا اور اونٹ ہوتا تھا اور نہ آج ہر ایک کے پاس گاڑی اور موٹر سائیکل ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں کوئی شخص پیدل جا کر شام تک سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے واپس آ جائے، اتنی مسافت پر ایک فقیہ ایک عالم یا ایک مفتی کی موجودگی ضروری ہے۔ اس کو فقہائے اسلام نے فرض کفایہ لکھا ہے، یہ ریاست کی ذمے داری بھی ہے۔ ریاست اگر یہ ذمے داری ادا نہیں کرتی تو اس کے ذمے دار گناہ گار ہیں، ورنہ پھر امتِ مسلمہ کی ذمے داری ہے کہ وہ اس کا انتظام خود کریں۔ متاخرین فقہا میں سے کئی حضرات خصوصاً علامہ ابن عابدینؒ نے اس پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے فرض کفایہ ہونے کو بیان کیا ہے، ردالمختار میں، جسے فتاویٰ شامی کہتے ہیں، اس پر تفصیل سے بحث ہے۔

لیکن ایک درجہ اس کے بعد کا بھی ہے۔ یہ تو وہ علما و فقہا ہوں گے، ماہرین شریعت ہوں گے جو عامۃ الناس کو رہ نمائی دیں گے۔ مگر مہارت شریعہ کا ایک درجہ ایسا بھی ہے جس میں ماہروں کی مہارت بھی درکار ہے۔ یہ علماء، مفتی حضرات اگر کہیں الجھیں گے تو کس سے رجوع کریں گے؟ تو ایک بڑی مہارت بھی ہونی چاہئے۔ امام ابوحنیفہؒ جس زمانے میں تشریف فرما تھے، ان سے چھوٹے درجے کے ماہرین بھی ہزاروں تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جس زمانے میں حیات تھے اس زمانے میں صحابہ اور تابعین بھی موجود تھے۔ جو نچلے درجے پر تھے، درمیان میں بہت سارے درجات تھے۔ تو ایک بہت اونچا درجہ بھی ہونا چاہئے۔ جن کی تعداد کا تعین فقہا نے نہیں کیا۔ لیکن اس اونچے درجے کے ماہرین دنیائے اسلام میں اتنی تعداد میں ہوں کہ عام علماء اور دوسرے حضرات ان سے رجوع کر سکیں، اور وہ نئے پیش آمد مسائل میں امت کی مؤثر رہ نمائی کر سکیں۔ یہ درجہ بھی امتِ مسلمہ کے ذمے فرضِ کفایہ ہے۔ یہ ساری

چیزیں وہ ہیں جوعقیدے کومضبوط بنانے کے لئے اس عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے ،اوراس عقیدے کے مطابق زندگی استوار کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔یہ ایک پہلو ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ شریعت نے عبادات کا حکم دیا ہے،جن کا مقصد اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کومضبوط کرنا اور بندے اور مادیات کے درمیان تعلق کومعقول حد میں رکھنا ہے ، بندے اور مادیات کے درمیان تعلق کوختم کرنا شریعت کا منشا نہیں ہے،شریعت نے کہیں نہیں کہا کہ مادی زندگی سے لوگ تعلق کے ختم کردیں، بل کہ شریعت نے اس تعلق کوختم کرنے کو ناپسند کیا ہے۔بے شمار احادیث اس مضمون کی موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فکر اور عمل کو ناپسند فرمایا ہے۔اس لئے عبادات کا مقصد اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا اور مادیات سے تعلق کومعقول حدود کے اندر رکھنا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَاO (۲۹)

اس سے مراد یہ ہے کہ اصل برائی یہ ہے کہ جو روح تقویٰ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے، ہر انسان کے دل میں رکھی ہے اس کو فنا کردینا یہ ناکامی ہے۔اگر اس کو فنا نہ کیا جائے،اس کو ترقی دی جائے تو پھر مادیات کی ساری چیزیں موجود رہیں تو بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس پر اکابر اسلام اور صوفیائے کرام نے جو لکھا ہے وہ اتنا بے زیادہ ہے کہ اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔صوفیائے اسلام نے بہت تفصیل سے اس میں اظہارِ خیال کیا ہے کہ مادیات سے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اور مادیات سے انسان کا رشتہ کیا ہونا چاہئے۔؟ مجھے ایک جملہ ایک ایسے صوفی شیخ کا بہت پسند ہے جن کے بارے میں علامہ اقبال نے بہت بڑی بات کہی ہے:

The greatest relegious genuise produced by Muslim India

مسلم ہندوستان نے سب سے بڑا مذہبی عبقری جو پیدا کیا ہے وہ ہے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی۔

اُن سے کسی شخص نے، غالباً ان کے کسی مرید نے پوچھا کہ جب سے آپ سے بیعت ہوئے ہیں اس وقت سے مادیات سے لاتعلقی کا رجحان پیدا ہو چلا ہے،تو اس کے بارے

۲۹۔ الشّمس:۱۰

میں آپ کی کیا ہدایات ہیں اور آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ مجدد الف ثانی نے بہت اچھی تشبیہ ذکر فرمائی۔ بہت بلاغت اور انتہائی اعجاز کے ساتھ آپ نے جملہ ارشاد فرمایا اور ایک عربی ضرب المثل استعمال فرمائی، اس کو سمجھنے کے لئے پرانے زمانے کی ایک پریکٹس کو سمجھنا ضروری ہے۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں کے ہاں سے انعام واکرام ملا کرتے تھے، آج بھی ملتے ہیں۔لیکن آج تمغہ ملتا ہے، گلے میں ڈال دیا، انہوں نے سند کاغذ میں لکھ کر دے دی، یا زمین الاٹ ہوگئی اس کا پرچہ مل گیا، پرانے زمانے میں نقد رقم ملتی تھی، اس کو اٹھانا آسان نہیں تھا۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے، عربی کے طلبہ کو میرا مشورہ ہوگا، مشکل کام ہے لیکن کریں ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی ہے، تیس جلدیں ہیں۔ پوری کتاب میں انتہائی فضول لغویات اور قصہ کہانیاں ہیں، بالکل جھوٹ، لیکن اس کی زبان بڑی غیر معمولی ہے اور یہ کتاب ادبیات کا بہت عمدہ نمونہ ہے، اس کو اول سے لے کر آخر تک پڑھیں۔ اس میں بے شمار ایسی چیزیں ملیں گی جو دوسرے معاملات کو سمجھنے میں آپ کو مدد دیں گی۔ سیرت کے بہت سے واقعات سمجھ میں آئیں گے۔ قبائل کے آپس کے بہت سے تعلقات سمجھ میں آجائیں گے۔ قرآن وحدیث کے بہت سے الفاظ کا پس منظر اور استعمال نیز عربی زبان وادب کے اسالیب سمجھ میں آجائیں گے، اس لئے کہ ان امور کا ادب سے تعلق ہے، اُس میں اس طرح کے واقعات بہت لکھے ہوئے ہیں کہ میں ہارون کے دربار میں گیا تو اس نے حکم دیا کہ مجھے ایک لاکھ اشرفیاں دے دو، میں نکلا تو محل کے باہر خچروں کی لائن لگی ہوئی تھی، اُس میں ایک لاکھ اشرفیاں لدی ہوئی تھیں، ظاہر ہے ایک لاکھ اشرفیاں جس کو انعام دیا ہے وہ خود تو نہیں لے جاسکے گا۔ اس کے لئے سرکاری خچر استعمال ہوں گے، گھوڑے استعمال ہوں گے۔ اب جب بادشاہ کسی کو انعام دے گا تو معمولی مریل خچر نہیں دے گا، یہ تو بادشاہ کی شان کے خلاف ہے، جس گھوڑے پر انعام لاد کر دیا جائے گا وہ اعلیٰ نسل کا گھوڑا ہوگا۔ اور یہ بادشاہ کی شان کے خلاف ہے کہ خچر ہم کو گھر چھوڑ دے اور واپس آجائے، یہ بھی نہیں ہوسکتا، انعام خچر سمیت اور ملازم سمیت دیا جاتا ہے، یہ پس منظر ہے، جس میں مجدد الف ثانی نے فرمایا ہے:

لایحمل عطا یا الملک الا مطایاہ

بادشاہ کے عطایا بادشاہ کی سواریاں ہی اٹھا سکتی ہیں۔

تو یہ جسم بادشاہ کی سواری ہے، اللہ تعالیٰ اگر کوئی انعام عطا فرماتا ہے، روحانیت کے مقامات عطا فرماتا ہے، کوئی درجات عطا فرماتا ہے تو وہ اس کی عطایا ہیں، اس کے انعامات ہیں، ان عطایا کے تحمل کے لئے اس جان کو پال پوس کے تیار رکھنا چاہئے، جیسے بادشاہوں کے اصطبل میں گھوڑے اور خچر تیار رکھے جاتے تھے کہ جب بادشاہ کا انعام بھیجا جائے گا تو ان پر لاد کر بھیجا جائے گا۔ تو بادشاہ کے انعام کے وصولی کے لئے اگر اس کو تیار رکھا، اس اندر کے بیل کو، خچر کو اس نیت سے تیار رکھو گے تو اجر ملے گا۔ اب اگر مادیات سے تعلق کی نوعیت یہ ہے۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کے مورد ہیں اور اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، اس کے لئے انسان کو تیار رہنا چاہئے، اس کے راستے میں کام کرنے کے لئے، جہاد کرنے کے لئے۔ تو یہ بات عین دین ہے، شریعت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

سید احمد شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آیا ہے کہ جو فرد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی کے پاس بیعت ہونے کے لئے آتا تو وہ تو کہتے تھے کہ سید صاحب سے جا کر بیعت ہو جاؤ۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا ہندوستان میں جو مقام تھا اس کا اندازہ ہر ایک کو ہے، آپ اپنے دور میں ہندوستان کے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے شیخ تھے۔ ان کے زمانے میں ان سے بڑا اور عالم اور ان سے بڑا شیخ شاید کوئی اور موجود نہ ہو۔ اور دونوں کا جامع تو کوئی نہیں تھا۔ اب ان جیسی شخصیت کی طرف سے یہ کہنا کہ سید صاحب سے بیعت ہو جاؤ، خاصے تعجب کا باعث تھا، سید صاحب خود نوجوان تھے، تیس بتیس سال کی عمر تھی اور پہلوانی قسم کا جسم تھا، اُسی قسم کا لباس تھا، اکھاڑے میں ورزش کیا کرتے تھے، لوگوں کو حیرت ہوا کرتی تھی کہ ہمیں اصلاح اور بیعت کے لئے ان کے سپرد کیا ہے، اور ہمیں ان کے سپرد شاہ صاحب نے کیا ہے۔ یہاں تک کہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے تلامذہ میں جو جید ترین دو عالم تھے جن کے بارے میں خود شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ "سرآمد علماء محققین" اور سرآمد علمائے مفسرین" مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ ان کو حکم دیا کہ سید شاہ صاحبؒ سے بیعت ہو جاؤ۔ سید صاحب سے بیعت ہونے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ ان کی ورزشیں نوافل سے بڑھ کر تھیں۔ اس لئے کہ وہ جس فریضے کی تیاری کے لئے تھیں وہ فریضہ اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

یہ گویا عبادات کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا تعلق اللہ سے مضبوط ہو جائے اور مادیات

سے تعلق کی نوعیت واضح ہو جائے، یہ شریعت کا دوسرا میدان ہے۔تحفظِ دین کے بعد دوسرا میدان ہے۔ایک میدان تو یہ تھا کہ عقیدہ درست ہو جائے،عقیدے کی درستگی کے یہ تین مدارج تھے۔دوسرا معاملہ یہ تھا کہ عبادات کے ذریعے انسانی زندگی میں مکمل ترتیب و تنظیم ہو جائے۔اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔اور کوئی آنے والا دن ایسا نہ گزرے جس میں اس تعلق میں بہتری نہ آئے۔بعض اوقات دلوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔صحابہؓ نے پوچھا کہ زنگ جیسے دلوں کو لگ جاتا ہے اُس طرح لوہے کو بھی لگتا ہے۔لوہے کے زنگ کو صیقل کرنے سے صاف ہو جاتا ہے دلوں کو صیقل کیسے کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ذکر اللہ سے اور عبادات سے'' یہ ساری تفصیلات ہیں،اس موضوع پر تفصیل سے بات کی جائے گی تو بات لمبی ہو جائے گی۔لیکن ان سب کا تعلق مقاصد شریعت سے ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ہر شخص انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس دین کے تقاضے پر کاربند ہو اور عمل پیرا ہو۔انفرادی طور پر ہر انسان،مسلمان اور اجتماعی طور پر اس کے لئے شریعت نے حکم دیا ہے کہ خود بھی کاربند ہو جاؤ اور دوسروں کو بھی رکھو۔آج کے ماحول کی وجہ سے یہ رجحان پیدا ہو رہا ہے اور بعض جگہ لوگوں کا یہ نظریہ بن گیا ہے کہ کسی کو دوسرے کے بارے میں کوئی پرواہ نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔مجھے اس کی فکر نہیں کہ آپ کا وقت کیسے گزرتا ہے۔آپ کو یہ فکر نہیں کہ میرا وقت کیسے گزرتا ہے۔یہ اسلامی رویہ یا اسلامی مزاج نہیں۔اسلامی رویہ اور مزاج یہ ہے کہ ہم میں تکافل کی کیفیت پائی جائے،میں آپ کا کفیل ہوں اور آپ میرے کفیل ہیں۔میں آپ کے معاملات سے دلچسپی لوں اور آپ میرے معاملات سے دلچسپی لیں۔قرآن پاک نے اس کے لئے مختلف اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ایک جگہ کہا ہے:

وتواصوا بالحق اور وتواصوا باالصبر (۳۰)

اور باہم حق پر قائم رہنے کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

یہ حق اور صبر کی اہمیت کیا ہے؟ حق اور صبر کی اہمیت بڑی معنی خیز ہے،جب انسان راہِ راست سے بہکتا ہے،بھٹکتا ہے تو اس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔آپ چاروں طرف اپنے غور کریں،اور کسی شخص کے بارے میں محسوس ہو کہ وہ راہِ راست سے بھٹکا ہے یا

۳۰۔ العصر:۳،۴

بہکا ہے تو غور کریں کہ یہ کیوں بہکا ہے؟ عموماً ۹۹ فیصد صورتوں میں سے دو میں سے ایک سبب ہوگا۔ بعض مستثنیات ہوتے ہیں، وہ نادر کے حکم میں ہیں۔ لیکن عمومی طور پر غالب ترین حالات میں دو میں سے ایک کیفیت ہوگی۔ یا تو اللہ نے اس سے کوئی نعمت عطا فرمائی ہے، اس نعمت کے حصول کے بعد وہ بہک جاتا ہے۔ کبھی نعمت اقتدار کی ہوتی ہے، جیسے فرعون اور نمرود کو حاصل ہوئی تھی، کبھی نعمت صحت وقوت کی ہوتی ہے، پہلوانی کی، جسمانی طاقت کی، کبھی حسن و جمال کی، کبھی مال و دولت کی تو وہ قارون ہو جاتا ہے، کبھی مقبولیت اور شہرت کی، کبھی کسی بادشاہ سے قربت کی، خود کچھ نہیں ہے نہ شہرت ہے نہ اقتدار ہے نہ پیسہ ہے نہ صحت ہے نہ قوت ہے نہ حسن و جمال ہے لیکن بادشاہ سے دوستی ہے۔ تو پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے:

بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

بادشاہ اور صاحب اختیار کا قرب بھی گم راہی کا ایک سبب بنتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز ہو تو وہاں انسان کو حق کی نصیحت کرنا مفید بل کہ ضروری ہوتا ہے۔ جب پہلی بار آدمی محسوس کرے کہ یہ شخص اس وجہ سے راہِ راست سے ہٹ رہا ہے تو وہاں حق کی نصیحت مفید ہوتی ہے۔ اور انسانی نفسیات کا یہ خاصہ ہے، آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ اخلاص اور دردمندی سے کہی ہوئی بات کبھی بھی بے اثر نہیں ہوتی، آج اثر نہ ہو بعد میں اثر ہوگا، زیادہ اثر نہ ہو تھوڑا اثر ہوگا۔ لیکن اخلاص اور دردمندی شرط ہے۔ کسی کو عار دلانا، کسی کو بدنام کرنا، پبلک میں اعلان کرنا، یہ شریعت کا منشا نہیں ہے۔ اس کا شریعت نے حکم نہیں دیا۔ نصیحت خاموشی سے ہوتی ہے۔ نصیحت اور تعییر میں فرق ہے۔ کسی کو عار دلانا، کسی کو بدنام کرنا نصیحت نہیں۔ نصیحت اور دردمندی سے جو بات کہی جائے گی، جب بھی کہی جائے گی اس کا اثر ہوگا۔ الا یہ کہ اللہ نے دلوں پر مہر لگا دی ہو۔ اس طرح کے لوگ تھوڑے ہوتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے، بیماری میں، بے روزگاری میں، اقتدار اور اختیار سے گر کر بدنامی کے گڑھے میں گر جاتا ہے، کوئی اور وجہ ہو جاتی ہے۔ وہاں اگر صبر کی تلقین کرنے والے نہ ہوں تو انسان حق کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ بے روزگاری اور پریشانی

کی وجہ سے کفر کا ارتکاب کرتے ہیں ۔کلمۂ کفران کی زبان سے نکل جاتا ہے۔ نمازیں چھوڑ دیتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں کیا دیا؟ نعوذ باللہ، ہم کیا کریں؟ اور اس طرح کی کفر کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وہاں صبر کی نصیحت کار بند ہوتی ہے۔ یہ ذمے داری مسلم معاشرے کی ہے اور ہر فرد کی ذمے داری ہے، کہ وہ ایسے لوگوں کو صبر اور حق پر کارمند رہنے کی تلقین کرتا رہے۔ کوئی فرد اس ذمے داری سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ اگر معاشرے میں ہر فرد، یا ہر فرد نہیں تو بڑی تعداد یا بڑی تعداد نہ ہوتو کم از کم ایک قابلِ ذکر اور مؤثر تعداد اس فریضے کی انجام دہی شروع کردے، تو اس معاشرے میں بہت حد تک بہتری لائی جاسکتی ہے۔

ضمناً ایک چھوٹی سی بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شکایت کسی کی مقصود نہیں ہے۔ ہمارے یہاں بعض دینی اداروں اور دینی تحریکوں نے اقامتِ دین کا نعرہ، دین قائم کرنے کا نعرہ بہت کثرت سے بلند کیا، اخلاص سے کیا، بہت اچھا کیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، لیکن اس نعرے کے بین السطور میں شاید کوئی اس طرح کا تصور تھا کہ دین کوئی ایسی چیز ہے کہ حکومت لا کے قائم کردے۔ کوئی ڈھانچہ ہے کہ لا کر میرے سر پر رکھ دے، جیسے کاٹھی گدھے کی پشت پر رکھی جاتی ہے، اُس طرح کی کاٹھی میرے سر پر لا کر رکھ دے۔ اس میں مجھے کچھ نہ کرنا پڑے، میں نہ اپنے آپ کو تبدیل کروں، میں کچھ نہ کروں، میرے سر پر کاٹھی شریعت کی لا کر کوئی لا ددے اور مجھے ہانکے جیسے گدھے کو ہانکا جاتا ہے، شریعت ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس میں حکومتوں کی ذمے داری نہیں ہے، حکومتوں کی ذمے داریاں ہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ حکومتوں نے اپنی ذمے داریوں کی ادائیگی میں کوتاہیاں نہیں کیں۔ انہوں نے کوتاہیاں بھی کیں لیکن بہ طورِ فرد کے کیا میں نے اپنی ذمے داریاں انجام دے دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ شریعت کا دوتہائی حصہ وہ ہے جو خود مجھے اپنے اوپر عمل کرنا ہے، جو خود میں اپنے اوپر نافذ کروں گا، حکومت جو نافذ کرے گی وہ تو ایک تہائی یا اس سے بھی کم ہے۔ بڑا حصہ دوتہائی سے بھی زیادہ وہ ہے جو میں خود اپنے اوپر نافذ کروں گا۔ کوئی دوسرے مجھ پر نافذ نہیں کرسکتا۔ کیا میں نے وہ نافذ کرلیا۔ کیا وہ حضرات جو اقامت شریعت، اقامتِ دین کے لئے تحریکیں شروع کررہے ہیں وہ اس دوتہائی پر بھی اتنی ہی توجہ دے رہے ہیں؟ اگر دوتہائی یا تین چوتھائی توجہ اس پر ہے کہ کم از کم ان کے متبعین شریعت کے حکم پر کاربند ہوجائیں، اور ایک تہائی

توجہ اس پر ہو کہ حکومت اپنے حصے کا فریضہ انجام دے اور ایک تہائی حصے کے احکامات نافذ کرے تو پھر ترتیب درست ہے۔ ورنہ اس ترتیب پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

جس زمانے میں میرے پاس حکومت کی ذمے داری تھی تو سود کی حرمت کے بارے میں سپریم کورٹ کا نیا نیا فیصلہ آیا ہوا تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ نے ایک کمیٹی بنائی، میں اُس کا چیئرمین تھا، ہمیں ان قوانین پر نظرِ ثانی کرنے کو کہا گیا جو سودی قوانین تھے۔ اخبار میں اس کی تفصیلات آتی رہتی تھیں، کوئی مبالغہ نہیں کر رہا ہوں، بلا مبالغہ میرے پاس روزانہ تین چار آدمی ملنے آتے تھے، اور بہت سے خطوط ملتے تھے، روزانہ کبھی درجن کبھی دو درجن کبھی کتنے کبھی کتنے خطوط آیا کرتے تھے، جس میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ میرے ذمے فلاں بینک کا، فلاں شخص کا، فلاں کمپنی کا اتنا سود واجب الادا ہے، سود کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے تو آپ اس سے کہیں کہ مجھ سے سود کا مطالبہ نہ کرے۔ لیکن اس دوران ایک آدمی بھی ایسا نہیں آیا، میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ایک آدمی بھی ایسا نہیں آیا جس نے کہا ہو کہ میرے ذمے فلاں کا سود واجب الادا ہے، میں اس کو دینا چاہتا ہوں، آپ بتائیے کہ میں اب کیا کروں؟ یا کسی نے یہ نہیں کہا کہ میرا سود کسی کے ذمے واجب الادا ہے، میں لینا نہیں چاہتا، بتائیے کہ میں اس کا کیا کروں۔ ایسا کوئی شخص نہیں آیا۔

اگر آج پاکستان کے سارے مسلمان سود لینے سے توبہ کرلیں تو سودی نظام ختم ہو جائے گا۔ پاکستان کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے، آج بھی نہیں ہے، پہلے بھی نہیں تھا جو مجھے یا آپ کو یا کسی اور کو سود لینے پر مجبور کرے۔ یہ میں آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ ایک بھی قانون ایسا نہیں ہے، جس کے تحت کوئی شخص سود لینے پر مجبور ہو اور پابند ہو۔ اس لئے اگر آج تمام لوگ طے کرلیں کہ سود نہیں لیں گے تو سود ختم ہوسکتا ہے، اور یہ سمجھنا کہ سود کے بغیر کاروبار نہیں چل سکتا، بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ میں پاکستان کے ایک درجن ایسے بڑے کاروباری حضرات کو جانتا ہوں جن کا اربوں روپے کا کاروبار ہے۔ انہوں نے خود مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے کبھی بھی کسی سودی بینک سے قرض نہیں لیا، ایک روپیہ بھی نہیں لیا، اور کبھی بھی کسی سودی کاروبار میں ملوث نہیں ہوئے۔ میں نے خود جا کر ان کی فیکٹریاں اور کمپنیاں دیکھی ہیں، تو یہ سمجھنا کہ فلاں کام حکومت کردے گی تو ہم بھی فلاں کام انجام دیں گے، ورنہ نہیں ہوسکتا، یہ غلط بات ہے، یہ اس تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

یہ تو وہ چیزیں ہیں جو افراد کی ذمے داری ہیں ۔ ایک ذمے داری حکومت کی بھی ہے اور وہ ذمے داری بھی وہ ہے، جس میں افراد بھی شریک ہیں ۔ قرآن پاک میں کئی جگہ اصطلاح آئی ہے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' قرآن پاک کی کم از کم ایک درجن آیات ہوں گی، جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ہوگا ۔ ان آیات کا جائزہ لیں تو یہ آیات چار طرح کی ہیں، جن میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر ہے ۔

ا ۔ کچھ آیات تو وہ ہیں جس میں فرد کو خطاب ہے، Individual کو مخاطب کیا گیا ہے:

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ (۳۱)

اے بیٹے! نماز قائم کر اور اچھے کاموں کا حکم کیا کر اور برے کاموں سے منع کیا کر ۔

اللہ کا ایک مقرب بندہ بیٹے سے خطاب کر رہا ہے اور قرآن پاک میں اس کا ذکر آیا ہے ۔ approval کے ساتھ، اس لئے وہ شریعت اسلامیہ کا حصہ ہے ۔ باپ بیٹے کو حکم دے دیا ہے کہ ''اے بیٹے! اچھائی کا حکم دے اور برائی سے روک'' یہاں کسی ریاست کی ذمے داری کی بات نہیں ہے ۔ یہاں کسی امتِ مسلمہ کی بات نہیں ہو رہی ہے ۔ یہ سب کی ذمے داری ہے ۔ لہٰذا ہر فرد اپنی سطح پر ایک سطح پر ذمے دار ہے کہ وہ اپنے حلقے میں باپ اپنے بیٹوں کو، ماں اپنی اولاد کو، استاد اپنے شاگردوں کو، افسر اپنے ماتحتوں کو، جو جو جس کے حلقۂ اثر میں ہے، وہ ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کا پابند ہو ۔ یہ ذمے داری قرآن پاک نے عائد کی ہے اور تمام فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ امر وجوب کرنے کے لئے ہے اگر کوئی اور قرینہ نہ ہو، یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے، اس لئے یہاں یہ امر وجوب کے لئے ہے ۔

۲ ۔ اس کے بعد قرآن پاک نے ایک جگہ کہا ہے:

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ (۳۲)

اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف

---

۳۱ ۔ لقمان: ۱۸

۳۲ ۔ آل عمران: ۱۰۴

بلائے اور نیک کاموں کا حکم کرے اور بری باتوں سے منع کرے۔

''مِن'' عربی زبان میں تبعیض کے لئے ہوتا ہے۔تبعیض یعنی کسی بڑی چیز کا ایک جز بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے،تم میں سے بعض گروہ ایسے ہونے چاہئیں،یعنی مسلمانوں میں بعض گروہ اور جماعتیں ہونی چاہئیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔یہ جماعتوں کی،تنظیموں کی اور اداروں کی ذمے داری ہے،ان کی سطح فرد سے مختلف ہوگی:

۳۔اس کے بعد ذمے داری ہے ریاست کی:

اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۳۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کاموں کے کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔

جب ہم ان کو زمین میں اقتدار اور قوت عطا کریں گے تو یہ انتظام ریاست اپنی سطح پر کرے گی،جس کے لئے اسلامی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں حسبہ کا ادارہ قائم کیا گیا۔خلفائے راشدین کے دور میں اس کو مزید وسعت اور ترقی ہوئی۔سیدنا عمر فاروقؓ نے جا بہ جا محتسب مقرر فرمائے اور فقہائے اسلام نے پہلے دور سے لے کر آج تک حسبہ کے قواعد اور احکام مرتب کئے ہیں۔ماوردی کی الاحکام السلطانیہ سے لے کر اور دور جدید کی کتابوں تک سیاست شرعیہ پر کوئی کتاب ایسی نہیں ہے،جس میں جز یئے کے احکام نہ ہوں۔کسی کو اچھا لگے یا برا لگے،کوئی اس کو پسند کرے یا نہ کرے،کسی کا سیکولر اور مغربی دماغ اس سے اتفاق کرے،یا نہ کرے جز یہ شریعت کا حکم ہے اور اسلامی ریاست کے ذمے واجب ہے،جو اس امر سے اتفاق نہیں کرے گا وہ گناہ گار ہوگا،اللہ پاک کے ہاں جواب دہ ہوگا۔اس کے پاس کیا عذر ہے؟ وہ جانے اور اس کا اللہ جانے۔لیکن یہ ذمے داری ریاست کی ہے۔ریاست کے بعد آخری سطح پوری امت مسلمہ کی ہے۔

۴۔ایک سطح پوری امت کی بھی ہے پوری کائنات کے لئے،پوری انسانیت کے

۳۳۔ الحج:۱۴

لئے، پوری امت سے خطاب ہے:

کنتم خیر امة اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳۴)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی، (کیوں کہ) تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو۔

یہ تین درجے تحفظِ دین کے مثبت درجات ہیں۔

منفی طور پر شریعت نے ان تمام راستوں کی بندش کی ہے، جو تحفظِ دین کے راستے حائل ہوں اور اس عمل کو ترقی سے روک سکیں۔ عقیدے کی پختگی پر نظر انداز ہو سکیں۔ اسلامی عقیدے کے بارے میں شک وشبہات پیدا کر سکیں۔ یہاں فرد کی ذمے داریاں بہت زیادہ ہیں، خاندان ومعاشرے کی ذمے داریاں بھی زیادہ ہیں لیکن ریاست کی بھی ذمے داریاں ہیں۔ یہ مغرب کا تصور ہے کہ کسی ریاست کا کسی فرد کے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یقیناً ایک حد تک کسی کے عقیدے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، یہ بات درست ہے۔ شریعت بھی یہی کہتی ہے۔ قرآن پاک میں اگر کہیں کوئی عقیدہ بیان ہوا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تعبیر وتشریح میں ایک سے زائد اجتہادات ہو سکتے ہیں، تو ریاست کسی ایک اجتہاد کو لوگوں پر مسلط کرنے کا اختیار نہیں رکھتی، یہ ریاست کو نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن اگر اسلامی عقیدے کے خلاف کھلم کھلا مسلم معاشرے میں کچھ افراد کارفرما ہیں تو ان کے خلاف کارروائی کرنا ریاست کی ذمے داری ہے۔

سیدنا عمر فاروقؓ نے ایسے لوگوں کو سزا دی۔ صبیغ میں ایک شخص تھا جو قرآن پاک کی سورتوں کے بارے میں شبہات پھیلایا کرتا تھا۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے اس کو بلا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ کوئی بنیادی شبہات اس کے دل میں نہیں ہیں، ایسے ہی فضول باتیں کرتا ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے خود بلا کر اس کو جسمانی سزا دی، تین دن اس کو سزا دیتے رہے، اتنی سزا دی کہ عام طور پر حضرت عمر فاروق کا معمول کا اتنی سزا دینے کا نہیں تھا۔ اور پھر جلا وطن کر دیا اور کہا کہ اگر مجھے دوبارہ اس کی اطلاع ملی تو اس سے بھی زیادہ سزا دوں گا۔

۳۴۔ آل عمران: ۱۱۰

آج سیکولرازم اور لامذہبیت کے حوالے سے لوگوں نے کہنا شروع کردیا ہے کہ ریاست کا لوگوں کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں، یہ بات درست نہیں، لوگوں کا مذہب سے تعلق ہے، ریاست اسلام کی محافظ ہے، اسلام کے تحفظ کی ضمانت دینے کی پابند ہے، اور اگر کچھ قوتیں اسلام کے خلاف کام کررہی ہیں تو ریاست اس کی ذمے دار ہے، اس کی مکلّف ہے کہ ان قوتوں کو روکے۔اس تصور کے خلاف اگر کچھ لوگ خیالات رکھتے ہیں تو وہ اسلامی خیالات نہیں ہیں، وہ سیکولر خیالات ہیں، لیکن اصل ذمے داری اس میں افراد کی ہے۔اس لئے کہ ایک حد تک ایسے معاملات ہیں جس میں ریاست دخل نہیں دے سکتی، ریاست کو دخل نہیں دینا چاہئے۔میرے دماغ میں کیا ہے۔میرے دل میں کیا ہے۔یہ میں جانتا ہوں یا میرا اللہ جانتا ہے۔یہاں ریاست کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔لیکن اگر میں کھلم کھلا ایسے خیالات کا پرچار کروں جو شریعت کے متفقہ عقائد کے خلاف ہوں تو ریاست کو مداخلت کرنی چاہئے۔اگر میں ایسے فاسد خیالات کا اظہار نہیں کرتا، یا کوئی اور شخص جو خیالات رکھنے کے باوجود ان کا اظہار نہیں کرتا تو ریاست کو مداخلت کا اختیار نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شریعت کے خلاف ایسے غلط خیالات کا اظہار کرتا ہے تو ریاست کو اس کا راستہ روکنا چاہئے۔یہاں آزادی رائے کا اسلامی تصور مغرب کے تصور سے متعارض ہے۔

مغرب میں مذہب محض ایک رائے کی حیثیت رکھتا ہے۔اہل مغرب کی نظر میں مذہب محض ایک رائے ہے، آپ کو اپنی رائے قائم کرنے کا اختیار ہے۔ان کو اپنی رائے قائم کرنے کا اختیار ہے۔آپ نے اس طرح کی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے، انہوں نے اس طرح کی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے۔آپ کو ایسی ٹوپی اوڑھنے پر کوئی مجبور کرے گا تو یہ بری بات ہوگی، آپ کو برا لگے گا۔وہ مذہب کے بارے میں اسی طرح کی رائے رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مذہب ایک ذاتی رائے ہے، آپ جو چاہیں رکھیں، نہ رکھیں تو نہ رکھیں۔اسلام میں مذہب کا یہ تصور نہیں ہے۔اسلامی دین اور شریعت پورے معاشرے کی اساس ہے پوری تہذیب کی اساس ہے۔ وہاں کے نظام کی اساس کو چیلنج کرنے والا وہاں بھی برداشت نہیں کیا جاتا۔کوئی آدمی جو سیکولر ڈیموکریسی کو چیلنج کرے وہ یورپ میں پنپ نہیں سکتا۔وہ قومیں جو سیکولر ڈیموکریسی پر زبانی ماننے کا اظہار کرتی ہیں لیکن عملاً ان کے معاشرے میں ایسے لوگ ہیں جو سیکولر ڈیموکریسی پر عمل پیرا

نہیں ہیں، وہ ان کے لئے قابل برداشت نہیں ہیں، تو اگر معاشرے کی اساس اور ریاست کی اساس کے خلاف اظہار خیال قابل قبول نہیں ہے تو اسلام میں معاشرے اور ریاست کی اساس دین اور اسلام ہے۔اس کے خلاف کوئی بات قابل قبول نہیں ہونی چاہئے۔وہ اگر اپنی اساس کے بارے میں حساس ہوں تو قابل قبول ہے۔ہم اگر اپنی اساس کے بارے میں حساس ہوں تو نا قابل قبول ہے۔یہ بات مسلمان پسند نہیں کرتے ،مسلمانوں کو اس سے اتفاق نہیں۔

ایک اور نازک معاملہ ہے، جس کا فقہائے اسلام نے ذکر کیا ہے۔یہ معاملہ ہے جس پر امام شاطبیؒ نے کسی حد تک تفصیل سے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اشارات میں اور امام غزالیؒ نے بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔وہ یہ ہے کہ جن معاملات میں شریعت نے اجتہاد کی گنجائش رکھی ہے، جن میں بعض معاملات عقائد کے بھی ہیں کہ متشابہات میں اللہ تعالیٰ نے وہ اسالیب اختیار فرمائے ہیں جو انسانوں کی فہم کے زیادہ قریب ہیں، عالم آخرت کے حقائق انسانی کی فہم اور بصیرت سے بالاتر ہیں:

مالا عین رات، ولااذان سمعت، ولا خطر علی قلب بشر

جو چیز نہ آنکھ سے دیکھی ہو اور نہ کان سے سنی ہو اور نہ کسی کے خیال سے گزری ہو، اس کو سمجھنا دشوار ہے، انسان اس کا اندازہ نہیں کرسکتا کہ وہ کیا ہے؟ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فہم کے قریب کرنے کے لئے اسے انسانوں کی موجودہ زبان میں بیان کیا ہے۔اسی لئے اس کے لئے متشابہات کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہے۔اب متشابہات کی تعبیر میں تین طرح کے رجحانات پیدا ہوئے ہیں۔

ا۔ایک رجحان تو مسلمانوں میں یہ پیدا ہوا کہ ان متشابہات کی تعبیر اور تفسیر خالص عقلی انداز میں کی جائے۔خالص عقلی انداز بھی ایک بڑی اضافی اصطلاح ہے، عقلی انداز کی بات انسان بہت کرتا ہے لیکن خالص عقلی انداز کبھی خالص عقلی انداز نہیں ہوتا۔جس چیز کو انسان خالص عقلی انداز کہتا ہے وہ انسان کے اس دور اور اس علاقے کے ماحول کے اثرات کے تحت کہی جانے والی بات ہوتی ہے۔جن چیزوں کو قبل مسیح کے یونانی بہت عقلی بات کہتے تھے آج وہ بالوضاحت بے وقوفی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔جن چیزوں کو قدیم ہندوستانی خالص عقلی باتیں کہتے تھے وہ بہت جلد غلط ثابت ہوئیں، آج بچہ بھی ان پر ہنستا ہے کہ ایک بیل ہے

اور اس کی سینگ پر کرہ ارض رکھا ہوا ہے، وہ بیل ایک مچھلی پر کھڑا ہے اور مچھلی نمک پر کھڑی ہے، یہ بات بہت سے لوگ کہتے تھے، قدیم ہندو کہا کرتے تھے، یونانیوں میں سے بعض لوگ کہا کرتے تھے، اس زمانے میں ان کی عقل کا تقاضا یہ تھا، اس طرح عقل کے تقاضے مختلف اوقات میں بدلتے رہے اور بعد میں آنے والے عقل کے تقاضوں نے پچھلی عقل کے تقاضوں کو مضحکہ خیز قرار دیا۔ اس لئے عقل کے تقاضے کی بات بھی کوئی بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن بعض حضرات نے اصرار کیا کہ عقل کے تقاضے کے مطابق تفسیر ہونی چاہئے۔ امت مسلمہ کے عمومی مزاج نے اس مجرد عقلی تقاضے کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔

کچھ حضرات نے کہا کہ ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ اس سے مراد کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ ہم اس کی لفظی اور ظاہری تعبیر کرتے ہیں، جو الفاظ میں آیا ہے بس وہ ہمارے لئے قابل قبول ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک جذبہ ایمانی کی بات ہے، ایک فنائیت کی دلیل ہے، جن حضرات نے یہ رائے قائم کی ان کے ایمان کی پختگی میں کوئی شک نہیں۔ ان کے ایمان کی پختگی اور اخلاص میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے کہا کہ ہمیں اس سے بحث نہیں، ہم تو اس کو ظاہری اور لفظی معنوں میں لیتے ہیں۔

لیکن امت مسلمہ کی غالب اکثریت نے ان دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔

اب جب ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کیا جائے گا، اس میں بہت ساری Variations ہوں گی۔ مثلاً دو بڑے بڑے نقطۂ نظر اہل سنت کے اصل موقف کی ترجمانی یا اکثریت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ مسلک اشاعرہ اور مسلک ماتریدیہ تھے۔ لیکن مسلک اشاعرہ میں خاصی Variations ہیں۔ مسلک ماتریدیہ میں خاصی Variations ہیں۔ مسلک ماتریدیہ میں ایک نقطہ نظر وہ ہے جن کی سرحدیں معتزلہ کے قریب ہیں یا ان سے سرحدیں مل جاتی ہیں۔ مسلک اشاعرہ میں کچھ وہ ہیں جن کی سرحدیں اہل ظاہر سے مل جاتی ہیں۔ یہاں بالکل کنارے پر یا گرے ایریا میں جو لوگ ہیں ان میں سے بعض کے بارے میں خیال ہوا کہ ان کی رائے درست نہیں ہے۔ ایسی رائے کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ آپ درمیان میں رہیں تو بالکل محفوظ ہیں۔ کنارے پر جائیں گے تو خطرہ ہوگا کہ کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ آپ کے خیال میں آپ حد سے نہیں نکلے، آپ دیکھتے ہوئے جا رہے ہیں، لیکن آپ

جسے حد سمجھ رہے ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ حد نہ ہو، حد پہلے ہی گزر چکی ہو، اس کا امکان موجود ہے۔ یہ تو ایک عقلی حد ہے کہ جو ظاہری طور پر موجود تو نہیں ہے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ درمیان میں رہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص کنارے پر اپنے علمی اعتماد کی وجہ سے چلا گیا ہے اور اس کے خیال سے وہ دائرے سے نہیں نکلا، آپ کے خیال میں نکل گیا۔ تو ایسے معاملات میں کیا کرنا چاہئے؟ یہاں تین اصطلاحات پیدا ہوئیں، تبدیع، تفسیق اور تکفیر۔ تغلیط تو درست ہے کہ آپ کہیں کہ میں اس کو غلط سمجھتا ہوں میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ وہ تو معاملہ آسان ہے آپ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے، اس کے ایمان اور اسلام کے بارے میں کچھ شک نہیں کرتے، نا اس کے تقوے میں آپ کو کوئی شک ہے مگر اس کی رائے سے آپ کو اتفاق نہیں ہے۔ یہ معاملہ تو صحابہ میں بھی تھا۔ ایک صحابی سے دوسرے صحابی کی رائے میں بعض اوقات اتفاق نہیں پایا جاتا تھا۔ لیکن جو مقامِ صحابیت ہے وہ اپنی جگہ ہے، ان کا درجہ، تقویٰ، اخلاص جو بھی وہ اپنی جگہ ہے۔ ایک صحابی کو دوسرے صحابی کی رائے سے اتفاق نہیں، دوسرے کو پہلے کی رائے سے اتفاق نہیں، کوئی بات نہیں۔ متاخرین میں سے بعض نے ایک کی رائے اتفاق کیا، بعض نے دوسرے کی رائے سے اتفاق کیا۔ لیکن جہاں معاملہ ان حدود پر چلا جائے وہاں کن حالات میں اور کن قواعد کے تحت تفسیق ہوسکتی ہے، کن حالات میں، کن ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے تبدیع یعنی بدعتی قرار دیا جاسکتا ہے، اور کون سے وہ استثنائی حالات ہیں جن میں تکفیر ہوسکتی ہے۔

یہ معاملہ بڑا نازک ہے اور اس پر بہت جامعیت اور تفصیل سے اظہار خیال کی ضرورت ہے، گفت گو میں اس وقت اس پر کوئی رائے نہیں دوں گا، مگر میرے ذہن میں یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے موقع دیا تو ایک سلسلہ محاضرات کا پروگرام ہے، محاضرات فکر و عقیدہ، اس میں ایک خطبہ یا ایک گفت گو میں اس موضوع پر بھی کرنا چاہتا ہوں کہ تکفیر اور تفسیق کے بارے میں امت مسلمہ کے اکابر اسلام نے کیا لکھا ہے، اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ امت مسلمہ کے اکابر میں چار بڑی شخصیتیں ایسی ہیں کہ جن کے کلام اور جن کی تفسیر و تشریح پر پوری امت مسلمہ کو جمع کیا جاسکتا ہے اور انہوں نے ایک ایسا متوازن اور جامع اور درمیانہ راستہ اختیار کیا ہے جس میں تمام چھوٹے موٹے اختلافات سموئے جاسکتے ہیں۔ ایسی شاہ راہ ان کے کلام سے متعین ہوسکتی ہے۔ جن میں سب سے پہلے امام طحاویؒ، دوسرے ہیں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ،

تیسرے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور چوتھے ہیں امام غزالیؒ۔ان چار کی تحریروں سے ایسی ایک تحریر مرتب کی جاسکتی ہے۔

لیکن ایک بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں جس پر اس مضمون کو میں ختم کر دوں گا۔ کچھ معاملات ہوتے ہیں جس میں تاویل کی گنجائش ہوتی ہے، تاویل کے مختلف درجات ہیں، ایک ہے تاویل باطل، ایسی تاویل جو بالکل، بالبداہت آپ کو باطل معلوم ہوتی ہے، وہ تو معتبر نہیں ہے، اس کے بعد ایک چھوٹا درجہ ہے تاویل رقیق، کم زور تاویل ہے لیکن ہے اور وہ تاویل بالکل باطل نہیں ہے، اور اس میں کسی حد تک حق کی آمیزش ہے، اور ایک ہے تاویل ضعیف۔ تاویل باطل کے بارے میں تو علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ اگر تاویل باطل کی وجہ سے کوئی شخص کسی عقیدے کا انکار کرتا ہے یا اس سے عقیدے کا ابطال لازم آتا ہے تو وہ تکفیر کے لئے کافی ہے۔اس کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا۔تاویل رقیق کے بارے میں اختلاف رہا ہے، کچھ حضرات جو محتاط ہیں، وہ اس میں احتیاط کرتے ہیں۔ جو دین کی حمیت زیادہ رکھتے ہیں، دین کے معاملے میں زیادہ متشدد اور پختہ ہیں وہ اس کی تکفیر کرتے ہیں۔تاویل ضعیف کے بارے میں غالب اکثریت کی رائے ہے کہ اس کی بنیاد پر تکفیر نہیں ہونی چاہئے۔آپ اس کی تغلیط کر سکتے ہیں، لیکن اگر تاویل ضعیف کی بنیاد پر کسی کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کر سکتے۔ اور تاویل، اسلام کے بین الاقوامی قانون کا ایک بہت بڑا اصول بھی ہے۔سیدنا علی بن ابی طالبؓ نے اس کو ایک بڑے جملے میں اختیار فرمایا۔خوارج نے جب تاویل کی تھی، تو سیدنا علی ابن ابی طالبؓ نے خوارج کی تکفیر نہیں کی۔ جب خوارج سے جنگ ہوئی تو سیدنا علیؓ بن ابی طالب کی زبان مبارک سے یہ جملہ نکلا:

> **نحن قاتلناکم علی انکارہ والیوم نقاتلکم علی تاویلہ**
> ماضی میں ہم تم سے اس لئے جنگ کرتے تھے کہ تم نے اس کا انکار کیا تھا (یعنی قرآن پاک کا) آج ہم اس لئے جنگ کررہے ہیں کہ تم اس کی تاویل باطل یا تاویل ضعیف کررہے ہو۔

سیدنا علی بن ابی طالب کے اس ارشاد سے فقہائے اسلام نے ایک اصول نکالا ہے کہ اگر تاویل اور منعہ جمع ہوجائیں تو اس کے احکام مختلف ہوتے ہیں۔ اگر صرف منعہ

ہو، تاویل نہ ہو، اس کے احکام الگ ہیں، اگر صرف تاویل ہو، منعہ نہ ہو تو اس کے احکام الگ ہیں اور اس کی بنیاد پر بین الاقوامی اسلامی قانون کا ایک پورا شعبہ تیار ہوا ہے، جس پر فقہائے اسلام نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے، جو ایک دوسری گفت گو کا موضوع ہے۔ یہ وہ معاملات ہیں جن کا تعلق تحفظ دین سے ہے۔ تحفظ دین پر زیادہ تفصیل کی ضرورت اسی لئے تھی کہ آج اس کے بارے میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور سیکولر اور لا مذہبی رجحانات کے فروغ کی وجہ سے غلط فہمیاں زیادہ پیدا ہوگئی ہیں۔

مقاصد شریعہ میں سے دوسرا مقصد ہے، تحفظ نفس، انسانی جان کا تحفظ۔ جب شریعت انسانی جان کے تحفظ کی بات کرتی ہے تو انسانی جان کے تحفظ میں محض حیوان ناطق کا تحفظ موجود نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھئے گا۔ حیوان ناطق منطق کے پڑھانے والوں نے سمجھانے کے لئے ایک اصطلاح بنالی۔ قرآنِ پاک انسان کو نہ حیوان سمجھتا ہے نہ وہ محض حیوان ناطق ہے۔ قرآن پاک انسانوں کو خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز سمجھتا ہے۔ **ولقد کرمنا بنی آدم** (۳۵) کے اعلان کے تحت مکرم ترین مخلوق سمجھتا ہے۔ اس لئے منطقی انسان کو حیوان کے حوالے سے سمجھنا شروع کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے حوالے سے انسان کو سمجھانا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میرے بعد تمہارا درجہ ہے۔ منطقی اور یونانی بتانا چاہتے ہیں کہ جانوروں کے بعد تمہارا درجہ ہے۔ جانوروں سے ذرا اوپر جاؤ تو تمہارا درجہ شروع ہوجاتا ہے۔ جب کہ درحقیقت جانوروں سے لے کر پھر الیٰ مالا نہایۃ لہ انسان ہی کا درجہ ہے۔ اس پورے درجے کے ساتھ انسان کا تحفظ۔ یہ ہے تحفظ نفس کا مقصد۔ تحفظ نفس کی خاطر شریعت نے اُسی طرح کے دو احکام دیئے، مثبت طور پر انسانی جان کا تحفظ اور منفی طور پر ان قوتوں کا سد باب جو انسانی جان کے تحفظ کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ چوں کہ انسان بہ حیثیت خلیفۃ اللہ اور بہ حیثیت مکرم ایک مقام اور مرتبہ رکھتا ہے، اس لئے اس مقام اور مرتبے میں ہر شخص شریک ہے۔ مسلم غیر مسلم، کافر، مومن ہر شخص اُس میں شریک ہے۔ یہاں پر بنی آدم کا ذکر ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۳۶)

۳۵۔ بنی اسرائیل: ۷۰

۳۶۔ بنی اسرائیل: ۷۰

اور بلاشبہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی۔

اس لئے کسی بھی انسان کی توہین اور تذلیل کی شریعت نے اجازت نہیں دی، حتیٰ کہ دشمن یہودی کی بھی توہین کی اجازت نہیں دی۔ مثال کے طور پر مثلے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میدان جنگ میں پرانے زمانے میں رواج تھا، عربوں میں آج بھی رواج ہے۔ مغرب میں اس کی مثالیں روز ہم دیکھتے ہیں، افغانستان اور عراق میں مقتول دشمن کی نعش کے خلاف توہین آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ کفارِ مکہ نے بھی کیا۔ یہ طریقہ اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ یہ سلوک ہوا۔ حضرت حمزہؓ کی میت کے ساتھ یہی ہوا اور دیگر صحابہ کے ساتھ بھی ہوا، لیکن اسلام نے اس کی ممانعت کردی۔ یہ تو اس کی ایک مثال ہے لیکن مثبت طور پر انسانی جان کے تحفظ کے لئے شریعت نے جو ہدایات یا رہ نمائی دی ہے، اس میں سب سے پہلی رہ نمائی جس کا ذکر سب سے پہلے میری معلومات کی حد تک شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے کیا ہے اور بہت تفصیل سے کیا ہے، وہ قرآن پاک کی ایک آیت سے وہ ماخوذ ہے، ممکن ہے متقدمین میں سے کسی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہو، میرے علم نہیں، لیکن شاہ صاحبؒ نے اس کو تفصیل سے ذکر کیا ہے اور شاہ صاحب کے بعد دورِ جدید کے اہل علم بہت تفصیل سے اس کا ذکر کرتے ہیں وہ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

واستعمر کم فیھا (۳۷)

تم سے مطالبہ کیا کہ اس زمین کو آباد کرو۔

تو گویا زمین کی آبادی اور تعمیر ارض اور عمارت ارض یہ انسانوں کی ذمے داری ہے، اور انسانوں کی ذمے داری ہے کہ کائنات میں انسانوں کے لئے سازگار ماحول پیدا کریں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اس روئے زمین پر انسانوں کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا:

انکم خلقتم للآخرة وان الدنیا خلقت لکم

تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو، اور دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے

ہر جمعہ کے خطبے میں ہم سنتے ہیں تو گویا روئے زمین پر انسانوں کے لئے سازگار ماحول کے لئے ایک سطح تو وہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے خود پیدا کردی ہے۔ اس کے بعد بقیہ سازگار

۳۷۔ ہود:۶۱

یاں پیدا کرنے کے لئے اور زمین پر انسانیت کو باقی رکھنے کے لئے انسانوں کو ہدایت کی گئی واستعمر کم فیھا اور تم سے مطالبہ کیا،تمہیں اس بات کا حکم دیا کہ اس روئے زمین کو آباد کرو۔شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کے پہلے باب میں، پہلے حصے میں جلد اول میں اس پر بہت تفصیل سے بحث کی، جو اسلامی فکر کی تاریخ میں ایک بہت منفرد مقام رکھتی ہے۔شاہ صاحب نے انسانی زندگی کے ارتقا سے بحث کی ہے اور اس کے چار درجات بیان کئے ہیں، ارتفاق اول، ارتفاق ثانی، ارتفاق ثالث، ارتفاق رابع، اور امتِ مسلمہ کے دور کو ارتفاق رابع کا دور بتایا ہے کہ امت مسلمہ کا دور ارتفاق رابع کا دور ہے۔ارتفاق اول وہ ہے جس میں انسان بہت ابتدائی سطح پر زندگی گزارتے ہیں یا ماضی میں گزارتا تھا، پھر جب وہ استعمر کم فیھا کے امر کے مطابق انسان حالات کو بہتر بناتا ہے تو دوسرا دور شروع ہوتا ہے، یہ ارتفاق ثانی ہے پھر تیسرا دور شروع ہوتا ہے پھر چوتھا دور شروع ہوتا ہے جو بین الاقوامی دور ہے، جس میں ایک عالم گیر پیغام کی ضرورت پڑتی ہے، جس میں ایک بین الاقوامی دین کی ضرورت پڑتی ہے، جس میں ایک عالمی خلافت اور عالم گیر نظامِ ریاست کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ وہ سب معاملات ہیں جن کا تعلق مسلمانوں سے اور اسلامی شریعت سے ہے۔

دوسرا پہلو شریعت نے جس کا حکم دیا ہے وہ منفی طور پر ان تمام راستوں کو روکنے کا حکم دیا ہے، جو انسانی جان کے تحفظ کے معاملے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

انسانی جان کے تحفظ میں جو چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں وہ تین طرح کی ہیں۔

ا۔کچھ تو معاملات وہ ہیں جو انسان کی تکریم کے خلاف ہیں، وہ سب حرام ہیں اور ناجائز ہیں، ریاست کو ان میں مداخلت کا اختیار ہے۔ جب تک ریاست یہ محسوس کرے کہ عامۃ الناس خود بہ خود اس کا سدّ باب کررہے ہیں، افراد کررہے ہیں، ارباب اہل وقت معاشرے میں کررہے ہیں، علماء، اساتذہ، دانش ور کررہے ہیں، وہ کرتے رہیں، لیکن جہاں یہ طبقہ ناکام ہو وہاں ریاست کو مداخلت کرنی چاہیئے اور کرامتِ آدم کے اصول کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔کرامتِ آدم کے اصول کے تحت بعض ایسے معاملات مسلمان فقہا نے ناجائز قرار دیئے ہیں جو بعض اقوام میں مذہبی فریضہ سمجھے جاتے تھے۔بعض مذاہب میں برہنہ پھرنا ایک نیکی کا کام تھا، آج بھی نیکی کا کام ہے۔ ہندوستان میں علما میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کو روکا جائے کہ نہ

روکا جائے؟ کچھ حضرات کا خیال تھا کہ اسلامی حکومت کواس کوسختی سے روک دینا چاہیئے۔کچھ علما کا خیال تھا کہ یہ اُن کا مذہبی عقیدہ بھی ہے اور ہم نے اُن کو مذہبی عقیدے کی آزادی دی ہے۔

ترکنا هم وما یدینون

ہم نے ان کواوران کے دینی معاملات میں ان کوآزادچھوڑدیاہے۔

یہ الفاظ خالد بن ولیدؓ کے ہیں۔تو اگر یہ ان کا دینی معاملہ ہے وہ برہنہ پھرنے کوروحانی بلندی کا تقاضا سمجھتے ہیں تو مسلمانوں کواس میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیئے۔بالاخر ریاست نے ایک درمیانہ راستہ اختیار کیا۔یہ برہنہ پھرنے والے سندھ یا پنجاب میں زیادہ نہیں تھے یہ جنوبی ہندوستان میں زیادہ تھے۔جب جنوبی ہندوستان میں مسلمان گئے،کچھ شمالی ہندوستان میں تھے تو مسلمان حکومتوں نے حکم دیا کہ برہنہ لوگ اپنے مندروں کی حد میں رہیں گے،مندروں سے باہر نہیں آئیں گے۔جب باہر آئیں گے تو کچھ نہ کچھ ستر عورت کا بندوبست کریں گے،اس کے بغیر انہیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔اس طرح کے بعض معاملات جن کا تعلق کرامتِ آدم سے ہے وہ وقتاً فوقتاً فقہائے اسلام کے ہاں زیرِ بحث آتے رہے۔یہ تحفظ انسانیت کا یا تحفظ نفس کا ایک پہلو ہے۔

۲۔تحفظ نفس کا دوسرا پہلو ہے انسانی جان کی فزیکل حفاظت،یا انسانی جان کا تحفظ۔ اس کے بارے میں شریعت نے جو احکام دیئے ہیں ان سے فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔اور فقہائے اسلام نے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے،فقہ کی ہر کتاب میں یہ مباحث موجود ہیں۔ایک کے بارے میں کہا ہے کہ''جنایۃ علی النفس''اور ایک کے بارے میں کہا ہے کہ''جنایۃ علی مادون النفس''انسانی جان کے خلاف جرائم،اور انسانی جان سے کم تر درجے کے جرائم۔اس معاملے میں جو تفصیلات فقہائے اسلام نے مرتب کی ہیں وہ انتہائی دقیق اور سائنٹیفک ہیں۔آج تک مغربی دنیا میں اس طرح کی تفصیلات سامنے نہیں آئیں۔میں مثال کے طور پر دو تین باتیں عرض کرتا ہوں۔اس طرح کی بات کرنے کا مجھے مغرب میں ایک دوبار اتفاق ہوا تو ان کو حیرت محسوس ہوئی،اور انہوں نے انتہائی حیرت کے ساتھ یہ تفصیلات سنیں۔ انسانی جان کا تحفظ کے لئے یہ تفصیلات اُس شریعت میں موجود ہیں جس کو وہ پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں۔''جنایۃ علی مادون النفس''،یعنی انسان جان پر کوئی زخم ڈالنا جس میں جان ضائع نہ ہو،اُس

سے کم تر درجے کے جرائم کی فقہا نے دو قسمیں بیان کی ہیں:

ایک قسم وہ ہے جو سر پر زخم لگے۔ایک وہ ہے جو سر کے علاوہ بقیہ حصے پر لگے۔

اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔کسی نے ان کو الگ الگ مانا ہے تو تین ہوگئیں، کسی نے دو مانا ہے تو دو ہوگئیں۔ایک ہے''جائفہ'' وہ زخم جو جوف تک چلا جائے،جسم کے اندر تک چلا جائے۔ایک وہ جو اندر تک نہ جائے،مثلاً بازو پر لگے گا تو بازو میں تو اندر کوئی جوف نہیں ہے، خلا نہیں کہ وہاں چلا جائے۔ران پر لگے، ٹانگ پر لگے، گھٹنے پر لگے تو وہ جائفہ نہیں کہلائے گا۔ ایک جائفہ ہے ایک غیر جائفہ ہے۔یہ بالکل سائنٹفک تقسیم ہے،کوئی آدمی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ یہ حقیقی قسمیں ہیں۔جو ٹانگ کا، پنڈلی کا یا گھٹنے کا زخم ہے وہ جلدی بھر جائے گا جو جائفہ ہوگا وہ دیر میں بھرے گا۔جائفہ کے اندر جو نقصانات ہوں گے،انتڑی زخمی ہوجائے گی،لبلبہ متاثر ہوجائے گا،جگر متاثر ہوجائے گا تو کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ کیا نقصان ہوا ہے؟ اندر سے علاج کرنا بھی دشوار ہے،اس لئے دونوں کی قسمیں الگ الگ ہونی چاہئیں۔ہر شخص بالبداہتہ اس کو ماننے پر مجبور ہے اور وہ اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ان دونوں کے احکام الگ الگ ہونے چاہئیں۔

جو سَر کے زخم ہیں شریعت میں اس کی جو تفصیلات ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔سَر کا ایک زخم وہ ہے جس میں ہتھیار کی ضرب، ڈنڈے سے مارا، پتھر سے مارا،تلوار سے مارا، گولی سے مارا، جو بھی ہتھیار استعمال کیا، سر پہ ضرب لگی لیکن صرف کھال پھٹ گئی اور اندر کی تر کھال نظر آنے لگی، باہر کی خشک کھال پھٹ گئی، یہ زخم کی سب سے کم صورت ہے۔ایک وہ ہے کہ تر کھال بھی پھٹ گئی اندر سے خون نکلنے لگا، پھر یہ ہے کہ اندر کی ہڈی نظر آنے لگی، پھر یہ کہ ہڈی ٹوٹ گئی، ہڈی اپنی جگہ سے ہٹ گئی اندر دماغ نظر آنے لگا، دماغ کے اندر زخم چلا گیا۔یہ مختلف مدارج ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے لئے شریعت نے الگ الگ احکام دیئے ہیں۔دیت کے احکام الگ ہیں، ضمانت کے الگ ہیں، ارش کے الگ ہیں، قصاص کے الگ ہیں۔اور یہ احکامات بہ راہِ راست احادیث میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے ہیں۔کسی فقیہ کے اجتہاد پر مبنی نہیں۔اور تمام تفاصیل ایک اصول سے بنی ہیں اس سے زیادہ معقول اصول ہو نہیں سکتا، میں نے ایک دو مغرب کے قانون دانوں سے پوچھا کہ اس کے علاوہ اگر کوئی اور اصول ممکن ہو تو بتائیے۔یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم قصاص کو نہیں مانتے،اس پر الگ بات کریں گے

کہ قصاص ہونا چاہئے یا نہیں ہونا چاہئے ، اگر قصاص ہونا چاہئے تو پھران احکام کے علاوہ کوئی اور احکام نہیں ہو سکتے ۔ اس سے انہوں نے اتفاق کیا کہ اس کے علاوہ کوئی اور احکام نہیں ہو سکتے ۔کلیہ یہ ہے کہ ہر وہ زخم انسانی جان پر کہیں بھی لگا ہو، وہ سر پر لگا ہو، پیر پر لگا ہو جائفہ ہو یا غیر جائفہ ہوا گرا یگز کٹ چیوٹ کے ساتھ ،مکمل مماثلت ،مکمل مشابہت کے ساتھ ،مماثلتِ کاملہ کے ساتھ اس کا قصاص لیا جا سکتا ہے تو وہاں قصاص لیا جائے گا۔ایک شخص نے چھری لی اور کسی کا کان یہاں سے پورا کاٹ دیا۔اب آپ اس کا پورا کان کاٹ دیں، اگر وہ مجنی علیہ مطالبہ کرے تو اس سے قصاص لیا جا سکتا ہے۔کسی نے گنڈ اسا لیا اور یہاں سے پورا ہاتھ کاٹ دیا، اس میں بھی قصاص ہوسکتا ہے۔اس کا ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے،لیکن بہت سے زخم ایسے ہیں جن میں مماثلتِ کاملہ ممکن نہیں ہے، ایک شخص نے ہتھوڑا لیا اور ایک شخص کے سَر پر زور سے ضرب لگائی ،اس کی ہڈی چٹخ گئی ،اب یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کے سر پر اتنے ہی زور کی ضرب لگائی جائے اور اس کی اتنی ہی ہڈی چٹخائی جائے ، یہ بات عملی طور پر مکمل نہیں ۔ یہ نہیں پتہ کہ اس کا زور کتنا تھا؟ اس کا ہتھوڑا کیسا تھا؟ اس کے ہاتھ میں کتنی قوت تھی ، غصے میں قوت بڑھ جاتی ہے، اس وقت اس کا غصہ کیسا تھا؟ اُس کی ہڈی کتنی کم زور تھی؟ ممکن ہے اس کی ہڈی چٹخ گئی، اس کی ہڈی نہ چٹخے ،اس نے ایک مرتبہ مارا تھا تو یہ کہے کہ میں دوبارہ ماروں گا اور ہڈی چٹخاؤں گا، دومرتبہ تو مارنا جائز نہ ہوگا ،ایک مرتبہ مارنے سے زیادہ چٹخ گئی، اس کی صرف ہڈی چٹخی تھی اس کی اپنی جگہ سے بھی ہٹ گئی ۔تو اس کے بڑے امکانات ہیں کہ اس میں مماثلت کاملہ ممکن نہ رہے ۔اس لئے یہاں شریعت نے قصاص کی اجازت نہیں دی ہے۔اس طرح کے تمام معاملات میں دیت یا ضمان کا حکم دیا ہے۔ یہ سارے احکام وہ ہیں جو انسانی جان کے خلاف ہیں ۔ جرائم کو روکنے کے لئے ہیں ۔قصاص کا حکم شریعت نے دیا ہے، قرآن پاک نے دیا ہے، اور اس سے انکار کرنا قرآن کا انکار کرنے کے مترادف ہے ۔لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ سزائے موت ہر صورت میں ظلم ہے اور ظالمانہ سزا ہے تو وہ منکر قرآن ہے۔ میں کوئی فتویٰ نہیں دے رہا، لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ قرآن کا منکر ہے۔لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سزائے موت ختم کر دینی چاہئے ، انہیں پہلے تو اپنے ایمان کی تجدید کرنی چاہئے ۔اس کے بعد کم از کم یہ استثنا رکھنا چاہئے کہ جہاں شریعت نے مکمل قطعیت کے ساتھ سے سزائے موت رکھی ہے، اس کے علاوہ ہم سزائے

موت ختم کر رہے ہیں۔اس میں بات ہوسکتی ہے، گفت گو ہوسکتی ہے، لیکن یہ کہنا کہ ہر صورت میں سزائے موت ختم کی جا رہی ہے۔ یہ قرآن کے انکار کے مترادف ہے۔

قرآن پاک نے انسانی قتل کی دو مثالیں تو صراحت سے بیان کی ہیں، قتل عمد اور قتل خطا۔ اشارتاً قتل شبہ عمد کی مثال بھی اس سے نکلتی ہے۔ ان تین قسموں پر تو فقہا کی غالب ترین اکثریت کا اتفاق ہے۔ امام مالکؒ صرف دو قسمیں مانتے ہیں، جو بہ راہِ راست قرآن میں آئی ہیں۔ قتل خطا اور قتل عمد۔ وہ درمیانی قسم کے قائل نہیں ہیں۔ فقہا کی اکثریت تیسری قسم کی بھی قائل ہے۔ اس لئے کہ بعض احادیث میں بھی اس کا تذکرہ ہے اور قرآن پاک میں بھی بعض آیات میں اشارتاً اس کا اشارہ ملتا ہے۔

علمائے احناف قتل کی پانچ قسموں کے قائل ہیں۔ وہ قتل خطا کی مزید ذیلی قسمیں کرتے ہیں، وہ اصل میں قتل خطا ہی ہیں، لیکن حنفیہ کے ہاں وہ ذیلی قسموں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ اس کی تفصیلات اور احکام موجود ہیں۔ الحمدللہ پاکستان کے قانون میں یہ سارے احکام موجود ہیں، اور وفاقی شرعی عدالت نے ۱۹۸۰ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ تعزیرات پاکستان کے وہ تمام دفعات جو احکام شریعت سے متعارض ہیں، کالعدم قرار دی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ اس میں قصاص اور دیت کے احکام کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس پر حکومت پاکستان نے اپیل کی۔ معلوم نہیں کیوں؟ ضیاء الحق صاحب کا زمانہ تھا وہ اس کے داعی تھے، انہوں نے یہ ترمیم کی تھی، انہوں نے ہی وفاقی شرعی عدالت قائم کی تھی۔ انہوں نے ہی اس کو اختیار دیا، اب ان ہی کی حکومت نے اس فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی اپیل دائر کر دی، میں نہیں جانتا کہ اس بات کا کس نے ان کو مشورہ دیا۔ ان کے اسلامی مشیروں میں کون تھا، یہ بھی مجھے علم نہیں ہے، لیکن ان کی حکومت نے اپیل دائر کر دی۔ جو دس سال سپریم کورٹ میں pending رہی اور دس سال بعد ۱۹۹۰ء میں سپریم کورٹ کے بینچ نے جس میں اُس وقت مولانا تقی عثمانی صاحب دامتِ برکاتھم اور پیر کرم شاہ صاحبؒ بھی موجود تھے، اُس فیصلے کو برقرار رکھا، اور حکومتِ پاکستان کو حکم دیا کہ ان ۵۴ دفعات کی جگہ متبادل قانون نافذ کیا جائے۔ اتفاق سے میں اُن دنوں اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا۔ اور اُس وقت کے اسلامی نظریاتی کونسل کے جو چیئر مین تھے آپ کے شہر کراچی کے رہنے والے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو جنت نصیب فرمائے، بہت نیک اور انتہائی متقی اور با اُصول

انسان تھے۔علمائے کرام سے تھوڑی سی شکایت کی اجازت ہے۔علمائے کرام سے ایک شکایت یہ ہے کہ ان کو اپنے حلقے سے باہر کے صلحا کا اکثر علم نہیں ہوتا۔ان کو پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ کون ہمارے حلقے سے باہر ہے، علما کا عام مزاج یہ ہے کہ عقیدت مندی سے آکے ہاتھ چومو تو آجاؤ، نہیں آتے تو مت آؤ، ہماری بلا سے۔وہ بہت متقی انسان تھے، میں نے ایسا مخلص ومتقی انسان نہیں دیکھا۔لیکن ان کی شہرت کسی مذہبی آدمی کی نہیں تھی، کبھی انہوں نے اس کا اظہار بھی نہیں کیا، کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ نظریاتی کونسل میں قرآنِ پاک کا کوئی حکم یا آیت سننے کے بعد اس سے استدلال کرتے تھے تو بڑا لطف آتا تھا، خوشی ہوتی تھی اور یہ حدیث یاد آتی تھی:

رب حامل فقه الى من هو افقه منه (۳۸)

چوں کہ قانونی ذہن تھا، اس لئے بہت جلدی بات کو پکڑ لیا کرتے تھے، بااصول انسان تھے، بہت دیانت دار انسان تھے اور آٹھ سال یا دس سال پاکستان کے چیف جسٹس رہے، اور آخر میں تنگ دستی کی حالت میں دنیا سے گئے، اس لئے کہ پینشن کے علاوہ ان کا کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں تھا، کوئی جائیداد نہیں تھی۔معمولی جائیداد جو شرفا کی ہوتی تھی وہ ان کی تھی۔ان کی بات یاد آگئی، وہ ایک ایسے باپ کے بیٹے تھے جن کو میں نے نہیں دیکھا لیکن میں نے ان کا نام سنا ہے، ان کے والد لکھنؤ کے بہت بڑے وکیل تھے اور پاکستان بننے سے پہلے ان کی پریکٹس ایک ڈیڑھ لاکھ روپے ماہ وار کی تھی۔ جب پاکستان بننے لگا تو قائداعظم نے ایک صاحب کو ان کے پاس بھیجا۔ان صاحب کا نام وسیم تھا، یہ میں جسٹس محمد حلیم کا تذکرہ کررہا ہوں جو چیف جسٹس آف پاکستان تھے۔قائداعظمؒ نے ان کے والد کے پاس ایک صاحب کو خط دے کے بھیجا۔اس میں لکھا کہ پاکستان بننا تو اب طے ہوگیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ پاکستان کے پہلے اٹارنی جنرل تم بنو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری آمدنی ایک لاکھ روپے ماہ وار ہے۔حکومت پاکستان تمہیں زیادہ تن خواہ نہیں دے سکتی۔ہم پانچ ہزار روپے ماہ وار تمہیں دے سکتے ہیں، تم یہ ذمے داری قبول کرلو۔وہ صاحب وسیم صاحب کے پاس گئے۔وسیم صاحب نے وہ خط دیکھا اور پھاڑ کے پھینک دیا اور کہا آپ جائیے، میں جناح صاحب سے خود بات کرلوں گا۔قاصد کو بڑی حیرت ہوئی، انہوں نے جا کر قائداعظم کو بتایا کہ انہوں نے تو یہ کیا ہے۔پھر وسیم صاحب قائد

۳۸۔ احمد: ج۴، ۵۷۸، رقم ۱۳۳۸۳

اعظم کے پاس گئے انہوں نے کہا کہ میں آپ کے پاس شکایت کرنے آیا ہوں، آپ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ وسیم ایک لاکھ روپے ماہ وار حکومتِ پاکستان کو دو، اور یہ ذمے داری قبول کرلو۔ آپ نے یہ کیوں کہا کہ پانچ ہزار روپے ماہ وار تن خواہ لواور یہ کام کرو۔ پاکستان اس لئے نہیں بنا کہ میں وہاں سے تن خواہ لوں۔ پاکستان اس لئے بنا ہے کہ میں اپنی جیب سے اس کے لئے قربانی دوں اور خدمت بھی کروں۔ اس طرح کے لوگ تھے جنہوں نے پاکستان بنایا۔

حلیم صاحب کا ذکر ضمناً آ گیا، انہوں نے مجھے اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے ذمے داری سپرد کی، انہوں نے ایک لیگل ریفارمز کمیٹی بنائی تھی۔ اس کا مجھے چیئر مین بنادیا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ ذمے داری دی کہ میں اس کا ایک قانون تیار کروں۔ قانون کے کچھ مسودے موجود تھے، ہم نے شب و روز محنت کر کے اس کا حتمی مسودہ تیار کردیا۔ غلام اسحاق خاں اس وقت صدر تھے اور بے نظیر صاحب کی حکومت برخواست کی جا چکی تھی۔ عبوری حکومت غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب کی سربراہی میں کام کررہی تھی۔ الیکشن ہونے والے تھے، سیاسی لیڈروں کو الیکشن سے دل چسپی ہوتی ہے تو جتوئی صاحب کی حکومت کو، ان کے وزرا کو اس مسئلے سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی کہ یہ فیصلہ آیا ہے اور نیا قانون بننا ہے، پتہ نہیں ان کے علم میں بھی تھا کہ نہیں تھا۔ سارا معاملہ غلام اسحاق خان کے ہاتھ میں تھا، وہی اس کو ہینڈل کررہے تھے۔ غلام اسحاق خاں دین دار آدمی تھے، نماز روزے کے پابند تھے، ان کی زندگی پاکیزہ زندگی تھی۔ لیکن وہ ایک مغربی تعلیم کے پس منظر کے آدمی تھے۔ یہ پورا مسودہ ہم نے تیار کرلیا اور اس پر کونسل میں اتفاق رائے ہوگیا۔ یہ مسودہ جب ہم نے صدر غلام اسحاق خان کو بھیجا تو چند معاملات میں ان کو اختلاف تھا، اور یہ دو معاملات تھے، جن پر اتفاق بہت مشکل ہوگیا اور بڑی مشکل سے ان کا حل تلاش کیا جاسکا۔ ایک تو وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے کہ عورت کی دیت آدھی ہے اور مرد کی دیت پوری ہے۔ نہ غلام اسحاق خان اس سے اتفاق کرتے تھے، نہ کوئی وکیل کرتا تھا اور نہ کوئی اور کرتا تھا۔ وہ کہتے تھے تصور یہ اس دنیا میں چل نہیں سکتا۔ دوسری چیز عاقلہ کا تصور تھا، جس پر مجھے اصرار تھا کہ عاقلہ کا حکم احادیث سے ثابت ہے، اور یہ نقطۂ نظر فقہائے اسلام متفقہ میں رہا ہے، اس لئے عاقلہ کا تصور تو ہونا چاہئے۔ غلام اسحاق خاں سمجھتے تھے کہ عاقلہ پر عمل درآمد ممکن نہیں ہوگا۔ تو میں نے بہت سوچ بچار کر کے اس کا ایک تصور سوچا، بعض علمائے

کرام سے جو اس وقت حیات تھے، میں نے مشورہ کیا۔ میں ان کا نام اس لئے نہیں لے رہا کہ ممکن ہے وہ اب اُسے اون (own) نہ کریں۔ یہ ایک رائے ہے، اس وقت اتفاق ہوسکتا تھا، اب شاید وہ اس سے اتفاق نہ کریں، اس لئے میں ان کے نام لے کر منسوب نہیں کرنا چاہتا، لیکن میں نے کئی ذمے دار حضرات سے پوچھا۔ انہوں نے اس سے اتفاق کیا، تو وہ بات ہم نے غلام اسحاق خاں کو پیش کر دی۔ اور غلام اسحاق خاں نے بھی اُس سے اتفاق کرلیا، اور وہ مان گئے۔ لیکن بدقسمتی سے آگے چل کر عاقلہ والے دفعات پھر انہوں نے نکال دیئے۔ عاقلہ والے دفعات تو انہوں نے نکال دیئے، لیکن قانون میں ایک ہوتا ہے جو (Consiquential Provision) کونسی کوئنشل پروویژن کہلاتا ہے کہ آپ نے ایک اصل دفعہ رکھی، پھر اُس دفعہ کے تقاضے سے کچھ اور دفعات ایسی رکھنی پڑتی ہیں، جو اس اصل دفعہ پر عمل درآمد کے لئے لازمی اور ناگزیر ہوتی ہیں۔

تو یہ دفعات کونسی کوئنشل پروویژن اس مسودے میں باقی رہ گئیں، جو Substentive) (Provisions دفعہ تھی عاقلہ کی وہ نکال دی۔ اُس کے بعد عدالتوں میں مسائل پیدا ہوئے کہ ان دفعات سے کیا مراد ہے؟ اب یہ بات کسی اور کے علم میں نہیں تھی، یہ میرے علم میں تھی یا نظریاتی کونسل کے چند ارکان جو دلچسپی رکھتے تھے ان کے علم میں ہوگی۔ میں خاصی کوشش میں کرتا رہا، لیکن یہ عجیب بات ہے اور بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ یہ آرڈیننس جو غلام اسحاق خاں نے جاری کیا تھا اور غالباً جون ۱۹۹۰ء میں جاری کر دیا تھا وہ برسوں تک پارلیمنٹ سے منظور نہ ہوسکا حتی کہ پارلیمنٹ آ گئی۔ لیکن پارلیمنٹ اس آرڈیننس کو منظور نہیں کرسکی۔ اس لئے کہ ہمارے اکثر ارکانِ اسمبلی کو اسلامی قوانین کے دفعات سے اختلاف تھا۔ ان کو بہت سی چیزیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، وہ مغربی قانون سے واقف تھے، انہیں اسلامی دفعات سمجھ نہیں آتی تھیں۔ پارلیمنٹ میں ایک لوئر ڈ پارلیمنٹ ایف، ایس کمیٹی ہوتی ہے، اس میں مجھے جانے کا موقع ملا کہ میں وہاں اس قانون کی وضاحت کروں۔ میں گیا، اُن سے بات کی ان کے اعتراضات سنے، جواب دیا، جواب الجواب اور اعتراضات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پارلیمنٹ ختم ہوگئی اور غلام اسحاق خاں بہ طور صدر ہر چار مہینے بعد اس آرڈیننس کو نئے آرڈیننس کے طور پر جاری کرتے گئے۔ آرڈیننس چار مہینے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری اسمبلی آئی جو ۱۹۹۳ء کے

الیکشن کے نتیجے میں قائم ہوئی۔معین قریشی وزیراعظم ہوئے۔کی، پھر پارلیمنٹ میں کمیٹی بیٹھی۔ پھر مجھے اُس میں بلانے کا موقع ملا، مجھے بلایا گیا۔بات ہوئی۔اس سے پہلے بھی میں ضیاء الحق صاحب کی شوریٰ میں جاتا تھا، ایک کمیٹی تھی، جس کے چیئرمین چوہدری الطاف تھے، جو بعد میں پنجاب کے گورنر ہوئے۔اُن سے بات ہوتی رہتی تھی۔اُن سے تبادلہ خیال ہوا، سوالات ہوئے، اعتراضات ہوئے۔جب آخر میں یہ معین قریشی والی پارلیمنٹ آئی، میں پھر گیا، پھر وہ اس طرح سوالات کرتے رہے، جواب درجواب کا سلسلہ جاری رہا۔اسی طرح آرڈیننس جاری ہوتے رہے۔مجھے صحیح تعداد یاد نہیں لیکن پاکستان کی تاریخ میں پہلا یہ قانون تھا جو غالباً بیس، پچیس مرتبہ جاری ہوا۔بیس بائیس مرتبہ وہ آرڈیننس، آتا رہا۔ارکان پارلیمنٹ کی جب شکایت کرتا ہوں تو بے بنیاد نہیں کرتا۔ارکان پارلیمنٹ میں سب آتے رہے ہیں، جبے قبے والے بھی آئے، دستار والے بھی آئے، لیکن یہ قانون اُسی طرح سے بغیر منظوری کے پڑا رہا۔ پارلیمنٹ کے زمانے گزرتے رہے، ان کمیٹیوں میں بڑے دینی حضرات بھی ہوتے تھے، لیکن مجھے یاد نہیں کہ کسی کمیٹی کی میٹنگ میں اُن حضرات میں سے کوئی آیا ہو، یہ آ کر اُس نے میری تائید میں کوئی بات کہی ہو؟ یا تو آئے نہیں، اگر آئے تو حاضری لگوائی اپنے حاضری کے بل پہ دستخط کئے اور چلے گئے۔بالآخر، آخری مرتبہ جب میں گیا تو ظفر علی شاہ اس وقت پارلیمنٹ کے ڈپٹی اسپیکر تھے۔پہلی مرتبہ مجھے بلایا، ان سے تعارف ہوا۔تو کہنے لگے کہ ہمیں آپ کی تشریف آوری کی بڑی خوشی ہے ہم آپ کے شکرگزار ہیں، آپ آئے ہیں تو اس موضوع کی گفت گو کا کیا فارمیٹ رکھیں؟ کیا ہم سوالات کریں آپ جواب دیں؟ میں نے کہا جی ایک فارمیٹ میرے ذہن میں بھی ہے، کہا وہ کیا؟ میں نے کہا: جو سوال آپ کریں گے، وہ میں کرتا ہوں کہ پہلے آپ یہ سوال کریں گے؟ میں جواب دیتا ہوں، پھر آپ جو اعتراض کریں گے، اس کا جواب دوں گا، کہ یہ اعتراض آپ کریں گے میں اُس کا جواب دوں، کہنے لگے یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے پندرہ سال ہوگئے ہیں، یہ کرتے کرتے، آئندہ بھی کرلیں گے، کہنے لگے اچھا۔خیر وہ تھوڑے سے نادم ہوئے۔شریف انسان ہیں، تو میں نے کہا یہ پہلا اعتراض آپ کا یہ ہے؟ وہ اس سے خوش ہوئے کہ ہاں! میں نے کہا اس کا جواب یہ ہے۔پھر تھوڑا تامل کیا، میں نے کہا آپ کے ذہن میں یہ اعتراض آیا ہے۔کہنے لگے ہاں۔اس کا

جواب یہ ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے، تیسرا سوال یہ ہے۔ پھر میں آخر میں ایک دستاویز پچیس، تیس صفحے لکھ کر لے گیا تھا، انہیں وہ دے اوران کے کرکہا کہ سرکار! آئندہ جب کوئی پارلیمنٹ آئے تو مجھے نہ بلایئے گا، یہ کاغذ سامنے رکھ دیجئے گا، اس میں سب سوالات جوابات لکھے ہوئے ہیں، جو آپ لوگ اب تک کرتے آئے ہیں۔ اس کے بعد خیر الحمدللہ! وہ پارلیمنٹ نے منظور کرلیا۔ وہ قانون بن گیا۔ لیکن اس میں تین چار چیزیں جو قسامہ سے تعلق رکھتی ہیں، انہوں نے پہلے بھی نہیں مانی تھیں، وہ نکال دی گئیں۔ عاقلہ والی بات بھی شامل نہیں ہوسکی۔ اور بہت ساری چیزیں نکال دیں، کئی چیزیں رہ گئیں اور یہ دیت والا معاملہ بھی رہ گیا انہوں نے مرد اور عورت کی دیت برابر کردی۔ میں نے اس کا ایک فارمولا، حیلہ کر کے نکالا تھا جس میں دونوں نقطہ نظر سمو دیئے جائیں، وہ منظور نہیں ہوا۔ لیکن میں اس تفصیلی مثال سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں ایک ایسا پریشر گروپ ہونا چاہئے، جو شریعت اور دین کے معاملات میں بہت حساس ہو۔ ہر وقت اس کی نظریں بیدار ہوں، پبلک اوپینین (Public opinion) کو تازہ اور تیار رکھے، اور جب کوئی دین کا معاملہ آئے تو فوری طور پر اس کو نافذ کروانے میں وہ آگے بڑھے۔

وقتی طور پر جب کسی کی سیاسی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو ہنگامہ ہوجاتا ہے، پھر دو چار مہینے میں ختم ہوجاتا ہے، پھر بات اسی طرح سے ٹل جاتی ہے۔ قانون اگر لکھا بھی جائے، کتاب میں آ بھی جائے تو عمل درآمد کو کوئی نہیں دیکھتا۔ عمل درآمد تو وہ کرتا ہے جس کا یا تو ذاتی کمٹمنٹ ہو یا اس کے، اپنے اندر سے احساس ہو جو تھوڑے لوگوں کا ہے، یا اس کے پیچھے کسی کا مفاد ہو، تو وہ شخص آگے آئے گا، وہ کسی کا ہے نہیں، اور اسلام کا ایک مزاج یہ ہے، اور اس کے روح میں یہ بات شامل ہے کہ جب تک آپ اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے کام نہ کریں تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔ غیر اللہ کے لئے کوئی کام انجام دیں گے تو وہ بے اثر رہے گا۔ آپ کتنا ہی کام کرتے رہیں وہ بے اثر ہوگا۔ جس دن اللہ کے لئے کام کریں گے اس کا اثر شروع ہوجائے گا۔ تو اس وجہ سے بھی بہت سے کام نہیں ہو پاتے ہیں۔ بہ ہر حال ضمناً یہ بات آ گئی۔ انسانی جان کے تحفظ کے لئے شریعت نے کیا احکام دیئے ہیں، یہ اس کا مختصر سا خاکہ تھا۔

تیسری چیز جو بڑی اہم ہے، وہ ہے انسانی عقل کا تحفظ، بہ ظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ جب انسان کا تحفظ ہوگیا تو انسان کے تحفظ میں عقل کا تحفظ بھی شامل ہونا

چاہئے ،لیکن شریعت نے اس کوالگ سے اس لئے رکھا ہے اور علمائے اصول نے اس کو اس لئے الگ سے بیان کیا ہے کہ ساری تکلیف شریعہ کا دارومدار انسانی عقل پر ہے، انسان مکلّف اس لئے ہے کہ اللہ نے اس کو عقل دی ہے، انسان مکرم اس لئے ہے کہ اللہ نے اس کو عقل دی ہے، انسان خلافتِ الٰہی کا مستحق اس لئے ہے کہ عقل کا علم بردار اور حامل ہے۔تو اس لئے عقل کا تحفظ دراصل اتنا ہی اہم ہے جتنا خود انسان کا جانی اور جسمانی تحفظ۔ یہاں بھی دونوں طرح کے معاملات ہیں۔شریعت نے عقل کے تحفظ کے لئے مثبت طور پر جو ہدایات دی ہیں ان میں بعض تو وہ ہیں جو دین کے تحفظ کے لئے ہیں اور انسانی عقل کو بھی ری انفورس کرتی ہیں، کچھ وہ ہیں جو بہ راہِ راست انسانی عقل کے تحفظ کے لئے ہیں۔انسانی عقل کے تحفظ کے لئے سب سے پہلے تو دین کی تعلیم ہے۔ پھر اخلاق کی تعلیم ہے پھر اس ماحول اور معاشرے کی تعلیم اور ان تمام فنون کی تعلیم جو انسانی عقل کی تشحیذ کے لئے ناگزیر ہوں۔

معاشرے میں انسان کو اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ ما تصح بہ المعیشہ کے تقاضے حالات اور وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔آج ایک تقاضا ہے، کل دوسرا ہے، پرسوں تیسرا ہے، پھر چوتھا ہے۔معیشت کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔اس کے حساب سے انسانی عقل کو تیار رکھنا ضروری ہے۔ جب تک انسانی عقل اس کے لئے تیار نہیں ہوگی معیشت اس کی محفوظ نہیں ہوگی۔ جب معیشت محفوظ نہیں ہوگی تو عقل بھی محفوظ نہیں رہے گی اور جان بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ جب جان محفوظ نہیں رہے گی تو دین بھی محفوظ نہیں رہے گا، اس لئے کہ دین پر عمل کہاں کرے گا جب جان محفوظ نہیں ہوگی۔ اس لئے ان سب چیزوں کا آپس میں منطقی طور پر ایک دوسرے سے ربط ہے۔ اور اُن تمام چیزوں کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے جو چیزیں انسانی عقل کو متاثر کرتی ہیں۔

انسانی عقل کو متاثر کرنے والی تین چیزیں ہیں۔ایک سے تو سب واقف ہیں اور مغربی دنیا اُس پر لٹھ لے کے اس لئے پیچھے پڑی ہے کہ اُس سے مسلمانوں کو اور افغانوں کو بدنام کرنے کا موقع ملتا ہے۔انہوں نے کہا کہ جو مخدرات ہیں جو انٹوکسی کینٹس ہیں یا نارکوٹکس ہیں وہ انسانی عقل کو متاثر کرتے ہیں۔ٹھیک ہے، کرتے ہیں، حرام ہونے چاہئیں، حرام ہیں، کاروائی ہونی چاہئے، لیکن اُن کا مقصد مخدرات کو حقیقی طور پر ختم کرنے کے بہ جائے اس سے مسلمانوں کو

اور افغانوں کو بدنام کرنا اور ان کے خلاف کاروائی کا جواز فراہم کرنا زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ حکومت پاکستان کے پاس ایک امریکی وفد آیا، ایک ذمے دار شخصیت سے ملا، وہ اُن ذمے دار شخصیت سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ آپ کے ہاں سے پٹھان اور افغان مخدرات اور منشیات کی اسمگلنگ کررہے ہیں۔ اس کو روکیں اور ہم بھی کاروائی کریں گے۔ اس ذمے دار شخصیت نے بات یہاں سے شروع کی کہ مخدرات اور منشیات کی اسمگلنگ کے دو مرحلے ہیں۔ ایک اس کی تیاری اور یہاں سے باہر بھیجنے کا، اور دوسرا مرحلہ ہے وہاں قبول کرنے اور پھر پروسس کرکے آگے لوگوں کو تک پہنچانے کا۔ آپ وہاں کے معاملات کو دیکھیں، ہم یہاں کے معاملات کو دیکھتے ہیں۔ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ نے کیا کیا ہے؟ ہم یہ بتائیں گے کہ ہم نے کیا کیا ہے؟ اس پر وہ ناراض ہوکر چلے گئے اور آئندہ اس شخصیت سے کبھی بات نہیں کی۔ بل کہ آئندہ کے لئے یہ شرط عائد کی کہ فلاں کو گفت گو میں شریک نہ کیا جائے۔ اس سے میرے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ دراصل مخدرات کا خاتمہ مقصود نہیں ہے۔ اگر مقصود ہوتا تو وہ اس گفت گو میں اس موضوع کو زیر بحث لاتے کہ ہم نے کیا کیا ہے، اور اس میں آپ ہماری مدد کیا کرسکتے ہیں؟ وہ اس کے پہلے حصے میں دل چسپی رکھتے ہیں کہ اس کو یہاں پیدا نہ کیا جائے۔ یہاں سے اس کو ایکسپورٹ نہ کیا جائے۔ لیکن جب ہوجائے تو ہم اس کا کیا کریں، اس میں آپ بات نہ کریں۔ یہ ہم پہ چھوڑ دیں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے، اس کا مطلب ہے آپ اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔

یہ برملا کہا جاتا ہے، بہت سے لوگوں نے لکھا ہے، میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، کوئی دلیل نہیں ہے، لیکن کثرت سے لوگ بیان کرتے ہیں کہ امریکی سی آئی اے اس کام کو کرواتی ہے، اور وہ اس سے ناجائز دولت حاصل کرتی ہے۔ دنیا میں ساری تباہی اور خرابیاں پھیلانے کے لئے جو دولت استعمال ہوتی ہے، وہ ان ہی مخدرات سے آتی ہے۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ یہ مخدرات موجود ہوں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ چیز پیدا ہو۔ اور جب پیدا ہوگی تو ہم اس کو ایکسپلائٹ کریں گے اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں گے۔ جب طالبان کی حکومت تھی، مخدرات کی پیداوار سو فیصد ختم ہوگئی تھی۔ اب مخدرات کی پیداوار دوبارہ شروع ہوگئی تو اگر واقعی وہ مخدرات کو ختم کرنے میں دل چسپی رکھتے تو طالبان کی حکومت کی تائید

کرتے، یا کم از کم اس حد تک ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ موجودہ حکومت پر دباؤ ڈالتے، لیکن انہوں نے یہ مسئلہ اب نہیں اٹھایا۔ آئندہ کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جان بوجھ کر اس طرح کے مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔ جب موقع ہوتا ہے اس کو اٹھاتے ہیں، پھر استعمال کرتے ہیں۔ اور ہمارے لوگ چوں کہ ہر گورے ہونٹ سے نکلنے والی بات کو حرفِ آخر، قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت سمجھتے ہیں، اس لئے اُس پر دل و جان سے عمل درآمد کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ ایک پہلو ہے مخدرات کا۔

۲۔ دوسرا پہلو ہے اُن چیزوں کا، ان علوم وفنون کا جو انسانی عقل یا توجہ کو سنجیدہ چیزوں سے مبذول کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک سنجیدہ مقصد کے لئے بھیجا ہے۔ انسان کی بڑی بھاری ذمے داریاں ہیں۔ اللہ کی جانشینی کی ذمے داری اُس کے سپرد کی ہے۔ شریعت کا حامل اس کو قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو لوگ شریعت کو قبول کرتے جائیں وہ دوسروں تک پہنچانے کے مکلّف ہیں۔ یہ سارا معاملہ انتہائی ذمے داری کا معاملہ ہے۔ اس لئے چھوٹے چھوٹے معاملات، چھوٹے چھوٹے مادی مفادات یا غیر اہم سرگرمیاں، اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ بہت سے حضرات ہر چیز پر یہ کہتے ہیں کہ جی اس میں کیا حرج ہے؟ ان تمام چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جمع ہو جائیں تو معاشرے ایک رنگ غیر سنجیدہ بن جاتا ہے، اور پورا معاشرہ غیر سنجیدہ سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات کسی چیز کو کلی طور پر حرام یا ناجائز کہنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ایک چیز اسلام کے مزاج کے خلاف ہوتی ہے۔ چھوٹی موٹی بہت ساری سرگرمیاں ہوتی ہیں، لیکن اسلام کے مزاج سے وہ ہم آہنگ نہیں ہوتیں، اگر پورے معاشرے میں دو چار پانچ لوگ کر رہے ہوں، ایک دو فیصد یہ کام کر رہے ہوں، تو اعتراض کا کوئی مقام نہیں ہے، لیکن اگر ساری قوم کو اس طرف لگا دیا جائے اور ساری قوم ایک ایسی سرگرمی میں لگ جائے جس کا کوئی مثبت نتیجہ نکلنے والا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ سنجیدہ مسائل سے پوری قوم کی توجہ ہٹا کر غیر سنجیدہ مسائل پر لگانا چاہتے ہیں۔ یہ چیز اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ اور شریعت اس کو بدلنا چاہتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ شریعت نے ایک اور چیز کا حکم دیا ہے جو بڑی اہم ہے۔ علوم و

فنون میں تین بڑی قسمیں ہیں ۔ علوم کا تعلق عقل سے ہے اور عقل کی علوم وفنون سے تشحیذ ہوتی ہے ۔ آدمی جتنا علوم میں بڑھتا ہے اس کی عقل تیز ہوتی ہے، لیکن علوم کے تین دائرے ہیں ۔

ایک دائرہ تو وہ ہے جو دینی اور شرعی علوم کا ہے، یا وہ علوم جو دینی اور شرعی تقاضوں پر عمل درآمد کے لئے ناگزیر ہیں ۔ جیسے دفاع ہے، دفاعی معاملات بہ راہِ راست شرعی علوم نہیں، لیکن وہ شرعی تقاضے بن جاتے ہیں ۔ اس لئے کہ ریاست کا، ملت مسلمہ کا دفاع ضروری ہے ۔ تو اس طرح کے معاملات جو شرعی ہوں یا شرعی مقاصد کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہوں وہ تو پہلا دائرہ ہے ۔

دوسرا دائرہ ہے فرائض کفایہ کا ۔ امام غزالیؒ نے، ابن تیمیہ نے اور کئی حضرات نے ان تمام علوم وفنون کے حصول کو فرض کفایہ قرار دیا ہے جو امت مسلمہ کی سیاسی عسکری اور اقتصادی آزادی کے لئے ضروری ہیں ۔ یہ فرض کفایہ ہے، جس کسی چیز کی وجہ سے مسلمان غیر مسلموں کے دست نگر ہوں اس کا حصول مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ ہے ۔ یہ فہرست وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہے گی ۔ آج اس میں نیوکلیر ٹیکنالوجی بھی شامل ہوگی، اسپیس (Sapce) ٹیکنالوجی بھی شامل ہوگی ۔ آج اس میں سیٹلائٹس کا علم بھی شامل ہوگا ۔ یہ ساری چیزیں شامل ہوں گی، اس طرح کے علوم ہیں جو مسلمانوں کو غیر مسلموں کو محتاج ہونے سے روکنے کے لئے ناگزیر ہیں، ان کا سیکھنا فرض کفایہ ہے ۔ ایک خاص سائنس ہے اس کی تفصیلات کا مجھے علم نہیں جس میں اسپیس ٹیکنالوجی اور نیوکلیر فزکس اور سیٹلائٹس کا علم، ان تینوں کو ملا کر ایک کوئی چیز بنائی جاتی ہے جس سے پوری دنیا پر نظر رکھی جاتی ہے اور دنیا میں ہر وقت ہر لمحے ہر چیز کو آپ دیکھ سکتے ہیں ۔ وہ اس وقت چیز بڑے بڑے ملکوں کے پاس ہے، امریکہ کے پاس ہے ۔ اگر امریکہ کا صدر اس وقت یہ چاہے کہ مجھے اور آپ کو یہاں بیٹھا دیکھے، ہماری شکلیں پہچانے، ہماری بات سنے، تو وہ اس ٹیکنالوجی کے ذریعے یہ کرسکتا ہے ۔ یہ ٹیکنالوجی مسلم ممالک میں صرف پاکستان کے پاس ہے الحمدللہ ۔ اور پاکستان اگر اس کو اسلام کے لئے استعمال کرے تو یہ اچھی چیز ہے اللہ کی ایک نعمت ہے ۔ دوسروں کی خدمت کے لئے کرے تو وبال ہے ۔ حکومت پاکستان کے پاس اتنی تو نہیں ہے جتنی امریکہ کے پاس ہے لیکن اس کی کچھ تفصیل ہے جس کی نزاکتوں کا مجھے زیادہ علم نہیں ۔ لیکن غالباً ایسا ہے کہ دنیا کا ہر گوشہ ۱۶ گھنٹے

کے بعد حکومت پاکستان کے مشاہدے میں آسکتا ہے۔چوں کہ سیٹلائٹ ہے وہ روئے زمین کی طرف گھومتا رہتا ہے اور زمین بھی گھومتی رہتی ہے تو ایسا نہیں کہ ہر وقت اتنے سیٹلائٹ ہوں کہ پوری زمین کو ہر وقت اپنے سامنے رکھیں۔چوں کہ روئے زمین گھومتی رہتی ہے اور وہ بھی گھومتا ہے۔تو آٹھ گھنٹے کا ایریا حکومت پاکستان کے مشاہدے میں رہتا ہے۔پھر اگلا ایریا ۱۶ گھنٹے بعد آتا ہے۔اس قوت میں اضافے کے لئے کچھ کام ہوتا رہتا ہے۔کتنا وقت لگے گا میں نہیں جانتا، لیکن ٹیکنالوجی پاکستان کے پاس موجود ہے۔الحمداللہ

اس طرح کے علوم ہیں جو مسلمانوں کو غیر مسلموں کا محتاج ہونے سے روکنے کے لئے ناگزیر اس، ان کا حصول فرض کفایہ ہے۔یہ ابھی تک صرف پاکستان کے پاس ہے کسی اور مسلم ملک کے پاس نہیں ہے۔اور دفاع کے ساتھ یہ چیز بڑی ضروری ہے۔اس وقت پاکستان کے پاس ایسے میزائل موجود ہیں جو ایٹمی وار ہیڈ بھی لے جاسکتے ہیں، جس کی رینج اس وقت تقریباً ساڑھے تین ہزار کلومیٹر تک ہے۔ساڑھے تین ہزار کلومیٹر کا نقشہ سامنے رکھ کر دیکھ لیجئے کہ کیا کیا اس میں آجاتا ہے، اور کم از کم آٹھ گھنٹے ایسے ہوں گے کہ اس میں حکومت پاکستان اس ہدف میں اپنی ہر چیز کو دیکھ بھی سکتی ہے کہ کہاں کس ہدف کو ٹارگٹ کرنا ہے۔یہ صلاحیت پورے چوبیس گھنٹے کے لئے حاصل ہو جائے تو تو پوری دنیا ہدف میں رہے گی۔اس کے لئے میزائل ٹیکنالوجی کی ترقی بھی ضروری ہے۔اور اس ٹیکنالوجی کی بھی ضروری ہے۔اسی طرح سے طبعیات ہیں، بقیہ ضروری علوم فنون اور معاملات ہیں۔

اس کے بعد کا جو ایریا ہے اس میں ادبیات بھی شامل ہے، اس میں شعر وشاعری بھی شامل ہے، اس میں اور بہت ساری چیزیں شامل ہیں۔امام شاطبیؒ نے اس کو "مُلح العلم" کہا ہے۔مُلح العلم یعنی علم کی چٹنی آپ اس کو کہہ سکتے ہیں۔شریعت میں جائز ہے کہ لوگ شعر وشاعری کریں۔ادب میں اپنا نام پیدا کریں۔مقامات حریری کی طرح کی کتابیں لکھیں۔ ادبیات میں کام کریں، مرزا غالب کی طرح اچھی شاعری کریں۔ان امور میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔لیکن یہ ملح العلم ہے، دسترخوان پر چٹنی تھوڑی سی ہوتی ہے۔اگر پلاؤ کے قاب کی طرح چٹنی کے قاب آپ بھر کے رکھ دیں اور کہیں کہ آپ تناول فرمایئے تو آدمی کی صحت برقرار نہیں رہ سکتی۔اگر علوم وفنون میں ملح العلم کا ریشو یا نسبت وہ ہو جائے جو چٹنی کی نہیں ہونی

چاہئے، پلاؤ کی ہونی چاہئے تو پھر سارا نظام مختل ہو جاتا ہے۔ اس لئے امام شاطبیؒ نے کہا ہے ادبیات کا ایک مقام ہے، بقیہ علوم وفنون کا ایک مقام ہے لیکن معاشرے میں دو چار پانچ فیصد پاکستان میں چند سو، چند ہزار افراد اگر شعر وادب اور اس طرح کے معاملات سے دلچسپی رکھیں تو یہ اچھی بات ہے۔ اگر آپ ساری قوم کو شعر وشاعری پر لگا دیں تو یہ بات ملک وملت کے مستقبل کے لئے درست نہیں ہے۔ اسی لئے بعض احادیث میں شعر وشاعری کے بارے میں اچھے الفاظ نہیں آئے ہیں۔ بعض جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سننا ثابت ہے، دلچسپی لینا بھی ثابت ہے۔ صحابہ کرام کے طرزِ عمل سے اس کی مثال ملتی ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ شعر وادب کے بڑے مزاج شناس تھے۔ صحابہ میں جن حضرات کی ادب شناسی بہت غیر معمولی مشہور تھی ان میں سیدنا عمر فاروقؓ بھی تھے۔ لیکن یہ ایک محدود چیز ہے۔ یہ ملح العلم ہے۔ اس کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔

اس کے بعد کا جو ایریا ہے اس کو حدیث میں علم غیر نافع یا علم ضار قرار دیا گیا ہے۔ گویا ملح العلم کے بعد کا جو درجہ ہے اس میں دو حصے ہیں، دو دائرے ہیں۔ ایک علم غیر نافع کا اس کا کوئی فائدہ نہیں، اللہ تعالیٰ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پناہ مانگی ہے۔ اس میں مسلمانوں کو وقت نہیں ضائع کرنا چاہئے۔ اس کا نقصان بھی نہیں ہے، نفع بھی نہیں ہے۔ نقصان یہ ہے کہ آپ کا وقت، آپ کی عمر ضائع ہو رہی ہے۔ اس کے بعد علم ضار ہے جس کا نقصان ہے، وہ فن دین کے لئے یا دنیا کے لئے نقصان دہ ہے۔ یہ بالکل ناجائز ہے، اور علم غیر نافع بھی کم از کم ناپسندیدہ ضرور ہے۔ یہ سب ہدایات انسانی عقل کو ایک انتہائی سنجیدہ ذمے داری پر کاربند رکھنے کے لئے ناگزیر ہیں۔ یہ وہ ہدایات ہیں جو انسانی عقل کے تحفظ کے لئے ہیں۔

نسل کا تحفظ فقہائے اسلام نے انتہائی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نسل کی اصطلاح بھی بعض حضرات نے استعمال کی ہے اور عرض کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ اس لئے کہ نسل اور عرض یعنی آبرو کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ لیکن مراد یہ ہے کہ ادارۂ خاندان نہ صرف موجود ہو، محفوظ ہو بل کہ بہت پروٹیکٹڈ ہو اور اس پر حملہ آور قوتوں کو ممکنہ حد تک روکا جائے اور ختم کیا جائے۔

خاندان کی اہمیت کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کر لیں کہ آپ قرآن پاک شروع سے پڑھنا شروع کریں، تو آیاتِ احکام آپ کو تقریباً تین سو، ساڑھے تین سو کے قریب ملیں

گی۔ان تین سو، ساڑھے تین سو آیات احکام میں تقریباً آدھی آیات ہوں گی جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ادارۂ خاندان سے ہے۔ نکاح وطلاق اور فیملی اور وراثت اور وصیت، ماں باپ اور حقوق اور اولاد، بالواسطہ، بلاواسطہ خاندان سے متعلق جو معاملات ہیں کم از کم آدھی آیاتِ احکام کا ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہے۔اس سے اندازہ ہوگا کہ شریعت کے عملی نظام میں خاندان کی اہمیت کتنی ہے۔قرآن مجید نے ان کاوشوں کو جو شوہر اور بیوی میں تفریق کا سبب بنتی ہیں شیطانی اور ساحرانہ کاوش قرار دیا ہے:

يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (۳۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کوششوں کو ابلیسی کوششیں قرار دیا ہے، جو شوہر اور بیوی میں تفریق کردے۔صحیح مسلم کی روایت ہے۔ ائمہ اسلام نے شوہر اور بیوی کے درمیان بے تکلفی کے معاملات کو بعض حالات میں نوافل سے بڑھ کے قرار دیا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسلام کی نظر میں خاندان کے ادارے کی اہمیت کیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لہولعب کی تمام اقسام کو لغو قرار دیا ہے،سوائے ان چند اقسام کے، تین چیزیں بہ طور مثال بیان کی ہیں۔اس میں ایک وہ ہے جو انسان کو جسمانی طور پر چاق وچوبند رکھے۔انسان کو جہاد کے لئے تیار رکھے اور جو خاندانی تعلقات میں خوش گواری پیدا کرے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں خاندان کی کیا اہمیت ہے،اسلام میں خاندان کی اہمیت تین اسباب سے ہے

۱۔ پہلا سبب جواب زیادہ relativ تھا یہ ہے کہ بعض مذاہب میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ خاندانی اور عائلی زندگی مذہبی اور روحانی تقاضوں کے خلاف ہے اور روحانی بلندیاں حاصل کرنے کے لئے خاندان سے لاتعلقی ناگزیر ہے، بدھسٹو ں میں یہ خیال موجود ہے، عیسائیوں میں ایک طویل عرصے تک موجود تھا، اب کم زور پڑ رہا ہے،اس غلط خیال کی تردید ضروری تھی،تعلیم کے ذریعے بھی اور طرزِ عمل سے بھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں طریقوں سے اس کی تردید فرمائی۔

۲۔دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ امت مسلمہ کا تحفظ سب سے زیادہ جس ادارے کی مدد سے کیا جاسکتا ہے وہ ادارہ خاندان ہے،جن معاشروں میں خاندان کا ادارہ محفوظ اور مضبوط

۳۹۔ البقرۃ:۱۰۲

ہے وہ معاشرے محفوظ اور مستحکم ہیں۔ جہاں خاندان کا ادارہ بکھر رہا ہے وہاں مسلم معاشرے بکھر رہے ہیں، اسی لئے مغرب کی طرف سے آج شدید ترین حملے جن اداروں پر ہیں اس میں خاندان کا ادارہ بھی ہے۔ اگر کبھی موقع ملے تو بیجنگ کانفرنس کی رپورٹ ضرور پڑھئے گا، جو قاہرہ میں بیجنگ میں اور کہاں کہاں ہوئی۔ بالکل بے حیائی اور بداخلاقی کی کھلم کھلا دعوت، اتنی عالم گیر سطح پر کبھی نہیں دی گئی جتنی ان کانفرنسوں کے ذریعے دی جارہی ہے اور مسلم ممالک کو زبردستی مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اس سے اتفاق کریں، اور ادارۂ خاندان کو تہہ بالا کردیں اور حیا اور شرم کے سارے تصورات کو فنا کردیں۔ چوں کہ مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور قوت ایسی موجود نہیں ہے جو ادارہ خاندان کے تحفظ میں کسی حد تک سنجیدہ ہے اس لئے زیادہ حملے دنیائے اسلام پر ہورہے ہیں۔

اور ایک بہت زیادہ دکھ اور افسوس کی بات ہے، جس کے بارے میں جتنا سوچتا ہوں مجھے دکھ ہوتا ہے۔ پاکستان میں سرکاری طور پر، ایک ادارہ موجود ہے کمیشن برائے حقوق نسواں، اس کی رپورٹیں آتی رہتی ہیں، اس کی ایک رپورٹ مطبوعہ موجود ہے جس پر کراچی کے ایک مشہور اور نیک نام جج کے دستخط ہیں، جو اپنے زمانے میں بہت نیک نام جج رہے اور ایک بہت نیک نام باپ کے بیٹے ہیں، بہ طور چیئرمین اس پر ان کے دستخط ہیں۔ مجھے پہلے غلط فہمی ہوئی کہ شاید ان کو رپورٹ پیش کی گئی تو انہوں نے Sign کردیئے ہوں گے، میں نے ان کو خط لکھا، وہ ناراض ہوئے، اور انہوں نے ناراضی اور ناخوشی میں جواب نہیں دیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ انہوں نے اس رپورٹ کو پڑھ کر باقاعدہ علی وجہ البصیرت دستخط کئے۔ اس رپورٹ میں جو باتیں ہیں وہ کوئی مسلمان آج سے پچاس سال پہلے کہہ نہیں سکتا تھا۔ کس قدر دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کا حال ہے، اور مزید یہ کہ وہ سابق وفاقی شرعی عدالت کے جج رہ چکے ہیں۔ کئی مرتبہ جی میں آیا کہ ان سے پوچھ لوں کہ کیا آپ اسی شریعت کے نفاذ کے لئے شریعت کورٹ گئے تھے؟ یہی شریعت نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کا احترام مانع ہوا۔ ملکی شخصیتوں کا احترام کرنا چاہئے۔ بہ ہر کیف ادارہ خاندان پر حملے شدت سے ہورہے ہیں اور اس میں مسلمان بھی سادہ لوحی میں یا کسی وجہ سے ساتھ دے رہے ہیں۔

۳۔ تیسری بڑی وجہ ادارہ خاندان کے تحفظ کی یہ ہے جواب کم زور پڑ رہی ہے لیکن ابھی تک موجود ہے کہ اسلامی شخصیت کی تشکیل میں آئندہ نسلوں کی اسلامی تربیت میں جو کردار خاندان کا ادارہ ادا کرسکتا ہے وہ کوئی اور ادارہ نہیں کرسکتا۔ جو تربیت گھر میں ہوا کرتی تھی، جو ماں کی گود میں ہوا کرتی تھی، جو دادی نانی کی گود میں ہوتی تھی، جو شروع سے اسلامی روایت رہی ہے، یہ تربیت اگر مضبوط ہوجائے تو بڑی حد تک اسلامی شخصیت کی تکمیل ہوسکتی ہے، اور اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

ان تین اسباب کی بنا پر شریعت نے خاندان کے ادارے کا تحفظ کیا اور مثبت طور پر اس کے احکام دیئے۔ منفی طور پر وہ تمام راستے شریعت نے روکے جو غیر اخلاقی ماحول کو جنم دے سکتے ہیں، جن میں خاندان کا ادارہ ڈائی لوٹ ہوتا ہے، جو خاندان کے ادارے پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں یا خاندان میں آپس میں محبت اور تعلق کو توڑنے کے مترادف ہیں۔ نفقے کے احکام شریعت نے دیئے ہیں، وراثت کے احکام شریعت نے دیئے ہیں، یہ ایک انتہائی حکمت پر مبنی ہیں اور جہاں اس کے دوسرے نتائج وثمرات ہیں۔ اسلامی معیشت میں اس کے نتائج وثمرات ہیں، دولت پھیلتی ہے، دولت کے پھیلنے کا شریعت نے حکم دیا ہے:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (۴۰)

تا کہ دولت تمہارے دولت مندوں ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔

یہ شریعت کے بنیادی احکام میں سے ایک ہے کہ دولت کا ارتکاز نہ ہو، بل کہ دولت پھیلتی رہے دولت کو قرآن مجید نے خون سے مشابہت دی ہے، قیاما للناس کہا ہے جیسے خون قیاما للفرد ہے، اسی طرح دولت قیاما للناس ہے، اگر خون ایک جگہ مجتمع ہوجائے تو انسان بیمار ہوجاتا ہے، خون ایک عضو میں آنا چھوڑ دے تو یہ ہاتھ مفلوج ہوجائے گا، اسی طرح دولت پوری معاشرے میں جانی چاہئے اور مسلسل جانی چاہئے، اس کا ایک نظام شریعت نے دیا ہے، اس کے لئے بہت سے احکام دیئے ہیں، ان میں سے ایک حکم وراثت کا حکم بھی ہے، میں اگر ایک شخص کسی نہ کسی طریقے سے، جائز طریقے سے دولت جمع کر بھی لے، اول تو کرنی نہیں چاہئے، کر بھی لے گا تو نفقات واجبہ کے طور پر جاتی رہے گی، پھر بھی بہت جمع ہوگئی تو وراثت میں تقسیم

۴۰۔ الحشر: ۷

ہو جائے گی،مزید تقسیم ہو جائے گی،دوسرے خاندانوں میں چلی جائے گی،مغرب کو اس پر کوئی اعتراض کبھی نہیں ہوا۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے اور میں اکثر پوچھتا ہوں جب کسی مغربی قانون داں سے ملاقات ہو کہ آپ کو عورتوں کے حقوق سے بڑی دل چسپی ہے اور آپ کو مسلمانوں میں عورتیں مظلوم نظر آتی ہیں،خواتین کی یہ مظلومیت مغرب میں کیوں نظر نہیں آتی ؟مغرب میں ایک اصول ہے، برطانیہ میں آج بھی ہے اور پاکستان میں برصغیر میں ۱۹۴۹ء قانون بنا جس میں وہ اصول ختم ہو گیا تھا وہ ہے Primogenenture، اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ صاحب جائیداد کے بعد باپ کے مرنے کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا وارث ہوگا، نہ چھوٹے بیٹے وارث ہوں گے، نہ بیٹیاں وارث ہوں گی، نہ بہنیں وارث ہوں گی،کوئی وارث نہیں ہوگا، سب محروم ہوں گے، سب سے بڑا بیٹا وارث ہوگا،آج تک کسی عورت کو میں نے نہیں سنا کہ اس پر آواز اٹھائی ہو کہ برطانیہ کی عورتوں کو محروم کیا گیا ہے یہ عورتوں کے حقوق کی خلاف ورزی ہے،اس نے ایسا کبھی نہیں سنا۔شریعت جو عورتوں کو حق دے رہی ہے اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ آدھا کیوں دیا؟ پورا کیوں نہیں دیا، پہلے اپنے ہاں خواتین کو آدھا تو دو پھر ہم پر اعتراض کرو، پھر ہم بتائیں گے خواتین کا حصہ آدھا کیوں ہے،اس وجہ سے میں اعتراض کرنے والوں کو نیک نیت نہیں سمجھتا، میرا خیال یہ ہے، ممکن ہے غلط ہو کہ جو اعتراض کرنے والیاں ہیں وہ نیک نیت نہیں ہیں، اگر اعتراض نیک نیتی پر مبنی ہوتا،تو وہاں بھی ہوتا جہاں یہ اصول آج بھی موجود ہے،آج بھی برطانوی کسی لارڈ کا انتقال ہو جائے تو Primogenenture کے اصول کے تحت سب سے بڑا بیٹا وارث ہوتا ہے۔لیکن شریعت نے بعض حکمتوں کے تحت وراثت کے احکام دیئے ہیں جس پر اپنی الگ لمبی گفت گو ہوگی لیکن اس کا ایک بنیادی اور اہم مقصد یہ بھی ہے کہ خاندان کے ادارے میں ایک تکافل پیدا ہو، جب آپ کسی کی ضروریات کے کفیل ہوں گے تو آپ کے اور اس کے درمیان محبت کا تعلق پیدا ہوگا۔ جب آپ سے کسی کو کچھ ملنے کی توقع ہوگی تو وہ آپ کے قریب آئے گا۔تو وراثت کے احکام میں یہ مسائل بھی شامل ہیں،مغربی دنیا میں اور خود ہمارے ہاں یہ ہو گیا ہے، افسوس کہ دادا کی اولاد سے کوئی تعلق نہیں، ہم میں سے کتنے ہوں گے کہ اپنے پردادا کی اولاد کو جانتے ہوں گے، کہ پردادا کی اولاد میں کون کہاں رہتا ہے، بعض صورتوں میں صرف نام سے واقف ہوں گے، زندگی بھر ملاقات نہیں ہوگی، کبھی

زندگی میں ایک مرتبہ شادی کی تقریب میں ملتے ہیں، اچھا فلاں کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شریعت نے بعض صورتوں میں دادا کی اولاد کو وارث قرار دیا ہے، بعض صورتوں میں دادا کی اولاد وارث ہوتی ہے، اگر اس کو یہ پتہ ہو کہ میں فلاں کا وارث ہوسکتا ہوں اور مجھ پر فلاں کی ذمے داری ہے تو ایک دوسرے سے ملنے جلنے کا رابطہ پیدا ہوگا، رابطے کے آثار پیدا ہوں گے۔ یہ وہ احکام ہیں جو شریعت نے خاندان کے ادارے کے اور نسل کے تحفظ کے لئے دیئے ہیں۔

پھر خود نسل کا تحفظ انسان زندگی بقا کے لئے ضروری ہے۔ انسانی زندگی کی بقا ادارۂ خاندان پر مبنی ہے۔ انسانی زندگی کی بقا کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں، تیسری شکل کوئی نہیں، ایک شکل یہ ہے کہ ہر انساں کو مادر پدر آزادی دے دی جائے، جانوروں کی طرح اس میں توالد اور تناسل کا سلسلہ ہو۔ یہ آج بھی شاید دنیا کے بیشتر انسان پسند نہ کریں، ساری بد اخلاقی کے باوجود شاید آج بھی لوگ اس کو درست نہ سمجھتے ہوں۔ مغرب اور مشرق کے لوگ اسے درست نہیں سمجھتے۔ یہ درست نہیں ہے، شریعت اس کو ناجائز سمجھتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ توالد اور تناسل کا سلسلہ خاندان کے ادارے کے ذریعے ہو اور ریگولیٹڈ ہو اور حیا اور اخلاق کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ جس کے لئے شریعت نے احکام دیئے ہیں، اگر ادارۂ خاندان ختم ہوجائے اور دوسری چیز جس کو دنیا ناپسند کرتی ہے وہ نہ ہو تو پھر نسل انسانی ختم ہوجائے گی۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یا حکمت تکوینی یہ ہے کہ ایک خاص وقت تک انسان دنیا میں رہیں، اور ان کی نسل برقرار رہے۔

آج سے کوئی بیس سال پہلے مجھے ایک ملک میں جانے کا اتفاق ہوا۔ تھائی لینڈ میں گیا، تھائی لینڈ میں ایک جلسہ ہونا تھا، یہ بڑھسٹوں کا جلسہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ آپ یہاں سیرت پر ایک تقریر کریں۔ ہمیں بتائیں کہ سیرت کیا ہے؟ اس میں کچھ مسلمان بھی تھے لیکن بڑھسٹ زیادہ تھے، میں نے کہا کہ میں سیرت پر بات کرنا چاہتا ہوں لیکن اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ میں بالکل سادہ اور بیانیہ اسلوب میں واقعات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے لے کر آخر تک بیان کردوں۔ اور بیان کر کے بیٹھ جاؤں۔ یہ تفصیلات وہ آپ کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں نے کتب کی نمائش لگا رکھی تھی، کتابیں رکھی ہیں آپ بھی پڑھ لیں۔ ایک شکل یہ ہوسکتی ہے کہ میں اس کی بعض خاص پہلو جو آپ کے دل

چسپی کے ہوں گے، بیان کروں۔ انہوں نے کہانہیں آپ یہ دوسرا اسلوب اختیار کریں اور دوسری طرح سیرت بیان کریں۔ میں نے کہا کہ اس میں سے بعض چیزیں اگر آپ کو ناپسند ہوں تو محسوس نہ فرمایئے گا۔انہوں نے کہا جی محسوس نہیں کریں گے تو اس وعدے پر کہ محسوس نہیں کریں گے میں نے ان سے کہا کہ ہمارے سامنے اس وقت جو لوگ بیٹھے ہیں، یہاں اس ہال میں ان کے سامنے دونمونے ہیں، ایک نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کا ہے اور آپ کے صحابہ کرام کا۔اگر میں یہ کہوں کہ دنیا اگر باقی اور زندہ رہنا چاہتی ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ دنیا باقی رہے تو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے کی پیروی کریں۔ حضور کے رول ماڈل کو مانیں۔اور اگر آپ چاہیں کہ دنیا چند سال کے بعد ختم ہو جائے تو آپ مہاتما بدھ کے رول ماڈل کو اختیار کریں۔ یہ سن کر وہ بولے (?What do you mean) آپ کی کیا مراد ہے؟ میں نے کہا میری مراد یہ ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا ختم ہو جائے، روئے زمین پر کوئی بسنے والا انسان نہ ہو، یہاں صرف جانوروں اور بھیڑیوں درندوں کی آماج گاہ ہو۔ جیسا کہ بتایا جاتا ہے کہ پہلے دنیا کی یہی حالت کی تھی تو آپ مہاتما بدھ کے رول ماڈل کو اختیار کرلیں۔اس لئے کہ مہاتما بدھ نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ان کا رول ماڈل یہ ہے کہ شادی نہ کرو۔ان کی جو شادی شدہ بیوی تھی اور چھوٹا بچہ تھا، اس کو نظرانداز کر کے چھوڑ کے جنگلوں میں چلے گئے تو اگر آج ساری دنیا کے پانچ چھ ارب انسان جنگلوں میں چلے جائیں اور آئندہ مناکحت کا سلسلہ ترک کر دیں، جو ہو گیا ہے اس کو چھوڑ دیں اور گھروں سے نکل کر جنگلوں میں درختوں کے نیچے جا کے بیٹھ جائیں تو سارے شہر بھی تباہ و برباد ہو جائیں گے، ملک بھی تباہ ہو جائیں گے اور آئندہ اولاد بھی پیدا نہیں ہوگی اور جو انسان موجود ہیں وہ بالآخر رَہ جائیں گے، بچے بے چارے بھوکے مریں گے، انہیں کون پالے گا؟ کون ان کو بھیک دے گا، یہ دنیاوی زندگی کو کیسے بسر کریں گے، تو جتنے لوگ زندہ ہیں وہ پچاس سال، ساٹھ سال، سو سال کے بعد مر جائیں گے۔اس لئے اگر واقعی ان کی شخصیت کی کامل پیری کرنی ہے تو پھر یہی ایک صورت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کریں اور اگر جزوی پیروی کرنی ہے تو آپ یہ پہلے مجھے بتائیں کہ اس جز کا معیار کیا ہے؟ کیوں آپ بعض چیزیں اُن کی قبول کر رہے ہیں، کیوں بعض چیزیں قبول نہیں کر رہے؟ میں تو کہتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی مکمل

پیروی کرو، ہر فیلڈ میں کرو، ہر میدان میں کرو۔آپ کہتے ہیں مہاتما بدھ کی جزوی پیروی کرو۔ میں کہتا ہوں اِس جز میں نہیں اُس جز میں کرو۔آپ کہتے ہیں اِس میں نہیں اُس میں کرو۔تو یہ اختلاف پیدا ہوگا۔تو یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا ایک لازمی حصہ ہے کہ ادارہ خاندان کا تحفظ نسل انسانی کی پرامن، پرحیا اور بااخلاق بقا کے لئے ضروری ہے۔

آخری چیز ہے تحفظ مال،اس پر زیادہ گفت گو کی ضرورت نہیں۔دنیا کے ہر قانون اور ہر نظام نے مال کے تحفظ پر زور دیا ہے،لیکن شریعت نے مال کو ایک خاص رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ایک پہلو تو اس کا نظری ہے لیکن اُس نظری پہلو کو اگر لوگ ذہنوں میں تازہ رکھیں تو اس کے اثرات طرزِ عمل میں ظاہر ہوتے ہیں۔نظری پہلو یہ ہے کہ تم اس مال کے مالک نہیں ہو،اس کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے۔تم اللہ کے جانشین ہو:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (۴۱)

اُس مال میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔

تو اگر میں یہ طے کرلوں میں اس گھڑی کا مالک نہیں ہوں،اس کا مالک اللہ ہے، میں تو اس کا جانشین ہوں،اس نے مجھے اجازت دی ہے تو میری حیثیت اس گھڑی کے استعمال میں اس مینیجر کی ہے جو کسی کی جائیداد کا متولی ہو،اس کو مینج کرلے۔اس کا کام یہ ہے کہ حفاظت کرے، اس کی دیکھ بھال رکھے، جو جگہ رہنے کو دی ہے، وہاں رہے۔دو وقت کا کھانا بھی کھالے، چائے بھی پی لے،اس سے زیادہ اس کو اختیار نہیں ہے،اس کو بیچ کر کھانے کا،رقم لے کر فرار ہو جانے کا اسے اختیار نہیں ہے۔یہ ڈاکہ ہے، یہ بددیانتی ہے، جتنا وہ کھا سکتا ہے اتنی اجازت ہے، یہ ضرورت نہیں کہ دوستوں کو دعوت دے دے کہ صبح وشام آیا کرو، ہزاروں آدمیوں کو کھلایا کرے، یہ بھی اجازت نہیں ہے۔ جہاں اجازت دی ہے وہاں اس پر عمل کرے، جہاں اجازت نہیں دی وہاں نہ کرے، یہی معاملہ اس گھڑی کے ساتھ ہے،جس حد تک اجازت ہے اُس حد تک ہے، جہاں نہیں ہے، وہاں اجازت نہیں ہے۔ یہ تو ایک نظری بات ہے لیکن اگر یہ بات ذہنوں میں تازہ رہے تو اس کے اثرات شخصیت پر پڑتے ہیں۔

دوسری بات شریعت نے یہ کہی ہے کہ مال کمانے کے راستے محدود ہیں۔خرچ

۴۱۔ الحدید:۷

کرنے کے راستے محدود ہیں۔نہ کمانے میں مکمل آزادی ہے، نہ خرچ کرنے میں مکمل آزادی ہے۔کمانے کے لئے قواعد ہیں،خرچ کرنے کے لئے قواعد ہیں۔اس لئے جو آمدنی ہوگی وہ جائز طریقے سے چھن کے آئے گی۔آپ چھلنی رکھ دیں جو چھلنی میں آسکے گا وہ ہی آئے گا اور جونہیں آسکے گا وہ نہیں آئے گا۔تو یہ جائز، ناجائز کی حدود مال کی چھلنی ہیں۔اور جو خرچ کرنے کی حدود ہیں وہ بھی مال کی چھلنی ہیں۔ناجائز میں خرچ نہیں ہوگا، جائز طریقے سے تو آپ کے پاس مال یا تو ضرورت کے مطابق ہی آئے گا جو شریعت کا مطلوب ہےاور اگر زائد ہوگا تو آپ کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کا موقع ملے گا۔اگر کسی کو توفیق نہیں ہوئی تو وراثت میں تقسیم ہوجائے گا، اس طرح دولت کا ارتکاز نہیں ہوسکے گا اور معاشرے میں اس کی ترسیل اور تقسیم تسلسل کے ساتھ ہوتی رہے گی۔جائز مال کو قرآن نے اللہ کا فضل قرار دیا ہے،اور خیر کہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی تلقین کی ہے۔مسلمان کو بے کار رہنے سے روکا ہے۔جو لوگ کسی کے جائز مال کو ناجائز طریقے سے لینا چاہیں، ان کے لئے احکام اور ہدایات ہیں۔حدود کے قوانین ہیں اور لین دین کے سارے معاملات، فقہ المعاملات، ساری کی ساری مال اور مال کی ملکیت سے تعلق رکھتی ہے۔فقہ اسلامی کا سب سے بڑا حصہ اپنے وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے فقہ المعاملات سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ ہیں شریعت کے احکام اور ہدایات، جو ان پانچ مقاصد کے حصول کے لئے دی گئی ہیں۔بعض چیزیں ممکن ہیں گفت گو میں رہ گئی ہوں، بعض چیزیں شاید ضرورت سے زیادہ تفصیل سے آگئی ہوں، تو تھوڑا سا گفت گو میں توازن نہیں رہا۔جس کی وجہ سے میں معذرت چاہتا ہوں۔

وآخر دعوانا الحمد لله رب العٰلمين